شعر العجم

حصّہ سوم

فغانی شیرازی سے ابوطالب کلیم تک

مادۂ تاریخ آغاز تصنیف	مادۂ تاریخ اختتام تصنیف
تاریخ عجم	تذکرہ
سنہ ۱۳۲۴ھ	سنہ ۱۳۲۵ھ

مصنّفہ

مولٰنا شبلی نعمانیؒ

باہتمام مولوی مسعود علی صاحب ندوی

مطبع معارف اعظم گڈھ میں طبع ہوئی

طبع پنجم

کتابۃ اقبال احمد

۱۹۵۶ء

فہرست مضامین

شعر العجم حصۂ سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایرانی شاعری

کا

دور آخر

ایران میں تیموری خاندان کا اخیر فرماں روا سلطان حسین مرزا تھا اس کے آخری زمانے میں سلطنت صفویہ کا آغاز ہوا جس کی اجمالی کیفیت یہ ہے کہ شیخ صفی الدین اردبیلی، ایک مشہور خاندان سادات کے سجادہ نشین تھے، ان کی اولاد میں سلطان حیدر ایک بزرگ پیدا ہوئے جن کے مرید قرمزی رنگ کی بارہ گوشے کی ٹوپی پہنتے تھے، اور اس مناسبت سے قزلباش کہلاتے تھے جس کا لفظی ترجمہ سرخ سر ہے، وہ ایک معرکہ میں شہید ہوئے، ان کے صاحبزادے شاہ اسمٰعیل نے محرم ۹۰۵ھ ہجری میں ستر آدمیوں کے ساتھ آذربائجان پر چڑھائی کی، اور رفتہ رفتہ اپنی جماعت اس قدر بڑھائی کہ شروان پر حملہ آور ہو کر وہاں کے فرماں روا کو شکست دی، انھوں نے ۲۵ برس کی مدت میں ایک وسیع سلطنت قائم کر لی، اور حکومت صفویہ کی بنیاد ڈالی ۹۳۰ھ میں انکا انتقال ہو گیا، ان کے بعد ان کے بیٹے طہماسپ نے سلطنت کو اور زیادہ ترقی دی، چنانچہ فوج کی تعداد ایک لاکھ چودہ ہزار تک پہنچائی اور دور دور تک کے صوبے فتح کر لئے ۵۵ برس

حکومت کر کے ۹۸۴ھ ہجری میں وفات پائی، ان کے بعد ان کا بیٹا اسمٰعیل مرزا اور پھر اس کے بعد اس کا بیٹا شاہ عباس ۹۹۵ھ میں فرماں روا ہوا، شاہ عباس وسعتِ حکومت اور انتظامات ملکی میں دوسرا اکبر یا شاہجہاں تھا، اُس نے ایران کو اس سرے سے اُس سرے تک زیر نگیں کیا، ازبکوں سے خراسان چھینا، آرمینیہ پر فتح حاصل کی، عراق عرب کو مسخر کیا، ترکوں سے برابر کی صلح کی، غرض خراسان سے لیکر عراق تک اُس کی حدود حکومت میں آگیا، اس نے ملک کے امن و امان آبادی اور سرسبزی کے لئے جو جو کام کئے ہندوستان کا تیموری خاندان بھی نہ کرسکا، ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک کارواں سرائیں بنوائیں جن میں مسافروں کے لئے سلطنت کی طرف سے تمام چیزیں مہیا رہتی تھیں، والہ داغستانی اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے

"جمیع عمارات معظمہ ایران بنا کردہ آں شہریار است، چندیں شہر در ماژندران و خراسان و عراق و آذربائیجان ساختہ است خصوصاً اصفہان را کہ رشک جناں نمودہ، قانونے بجہت مہمانداری مسافران بحر و بر بستہ بود کہ در جمیع مراحل و منازل از یک ہزار و از ہزار تا دہ ہزار از غریب و تونگر از رعیت و سپاہ کہ از بومی و غریب ہر کس و ہر قدر بودند، در کارواں سراہا ساختہ است، ہرگاہ وارد می شدند، ہماں لحظہ ما یحتاج حتیٰ بستر و فراش در خور ہر کس ملازمان شاہی کہ باین کار گماشتہ بودند، حاضر می کردند و ظروف در کمال تکلف از چینی و غوری وغیرہ در ہر منزل و مکان آں قدر بودہ کہ ہمہ مسافران را کفایت ہمی کرد و باز بہ تحویلداران مکان سپردہ می شد و ایں امر بیشتر از عراق تا ماژندران بودہ و در اطراف و بلاد دیگر نیز رواج داشتہ لیکن نہ باین افراط"

شاہ عباس نے ۴۴ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۰۳۸ھ ہجری میں وفات پائی، اس کے بعد شاہ صفی اور اُس کے بعد شاہ عباس ثانی تخت نشین ہوا، اور ۱۰۷۷ھ ہجری میں

وفات پائی،

اس خاندان نے اگرچہ سنی مذہب کو نہایت ظلم اور بے رحمی اور سفاکی کے ساتھ ایران سے معدوم کر دیا یعنی جو لوگ شیعہ مذہب قبول نہیں کرتے تھے وہ قتل کر دیئے جاتے تھے، چنانچہ مآثر الامرا وغیرہ میں اس کی متعدد داستانیں نقل کی ہیں،

لیکن بہر حال تمام ملک میں یکسوئی پیدا ہو گئی، اتنا بڑا وسیع ملک جھگڑوں سے پاک ہو گیا، تمدن و تہذیب[1] کو نہایت ترقی ہوئی، ہر چیز میں حد سے زیادہ نفاست اور تکلف شروع ہوا اس کا اثر شاعری پر بھی پڑا اور اس لئے شاعری میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہو گئی، صفوی خاندان خود صاحب علم و فضل اور سخن سنج اور سخن شناس تھا، اس لئے اس نے شعر کی نہایت قدر و منزلت کی،

شاہ عباس ایک دفعہ کوکبۂ شاہی کے ساتھ جا رہا تھا، ادھر سے حکیم شفائی مشہور شاعر آ رہا تھا، شاہ عباس نے سواری سے اترنا چاہا، شفائی نے بڑے اصرار سے روکا، تاہم امرا اور درباری گھوڑے سے اتر پڑے[2]، شاہ عباس اکثر مسیح کاشی کے گھر ان سے ملنے جایا کرتا تھا

چونکہ اسی زمانے میں ہندوستان میں تیموری خاندان شاہانہ فیاضیوں کا دریا بہا رہا تھا اور ایران کے شعرا دولت کی کشش سے ادھر کھچے چلے آتے تھے، اس لئے صفوی خاندان اور بھی رقیبانہ حوصلہ مندیوں پر مجبور ہوتا تھا، لیکن ایران سے اس معرکہ میں آخر ہندوستان ہی نے بازی جیتی،

---

[1] خدانخواستہ اس کے یہ معنی نہیں کہ سنی مذہب کے مٹانے کو تہذیب و تمدن میں دخل ہے، بلکہ غرض یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں مذہبی نزاعیں مٹ جائیں تو ضرور ملک میں ترقی ہوگی، اگر ایران میں شیعہ مذہب بالکل مٹ جاتا تب بھی یہی نتیجہ ہوتا، [2] سرو آزاد،

ہندوستان میں اگرچہ شاعری بابر کے ساتھ آئی، چنانچہ آتشی قندھاری جس کا یہ مطلع مشہور ہے،

سرشکم رفتہ رفتہ بے تو دریا شد تماشا کن　　بیا در کشتیٔ چشم نشین و سیرِ دریا کن

بابر[1] کے ساتھ ہندوستان میں آیا، لیکن شاعری کی تربیت بیرم خانخاناں سے شروع ہوئی، وہ خود پختہ کار شاعر تھا، اور ترکی و فارسی دونوں زبانوں میں کہتا تھا، اکثر شعرا اس کے دربار میں ملازم تھے، نظیری سمرقندی نے اس کے اشارہ سے شاہنامۂ ہمایونی لکھنا شروع کیا تھا اور کئی داستانیں نظم کیں، چنانچہ جب سکندر لودی کا معرکہ نظم کرکے سنایا تو بیرم خانخاناں نے اس پر نکتہ چینی کی، نظیری نے بیرم خاں کی اصلاح اور ہدایت کے موافق ایک رات میں چار سو شعر لکھ کر سنا دئے اور بیش بہا صلہ حاصل کیا، بدایونی نے بعض اشعار بھی نقل کئے ہیں،

اکبر گو اُمی تھا لیکن نہایت خوش ذوق اور قدردانِ سخن تھا، اُس نے ملک الشعرائی کا خاص عہدہ قائم کیا، جس پر سب سے پہلے غزالی مامور ہوا، اکبر کی فیاضیاں دیکھ کر ایران کے تمام شعرا ہندوستان میں اُمنڈ آئے، اکبری شعرا کی فہرست جو ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں درج کی ہے حسب ذیل ہے:۔

حکیم[1] ثنائی، غزالی[2]، عرفی[3]، نظیری[4] نیشاپوری، حزنی[5] اصفہانی، قاسم[6] کاہی، میلی[7] ہروی، جعفر[8] بیگ قزوینی، خواجہ[9] حسین مروی، حیاتی[10] گیلانی، شکیبی[11] صفاہانی، انیسی[12] شاملو، صالحی[13] ہروی، محوی[14] ہمدانی، صرفی[15] ساوجی، قراری[16] گیلانی، عتابی[17] نجفی، ملا عشوقی[18] مازندرانی، جدائی[19] مرزی، وقوعی[20] نیشاپوری، خسروی[21] قائنی، وفائی[22] سپاہانی، شیخ[23] ساقی، رفیعی[24] کاشانی، غیرتی[25] شیرازی، حالتی[26]، سنجر[27] کاشی، جذبی[28]، تشبیہی[29] کاشی، اشکی[30] قمی، اسیری[31] رازی، فہمی[32] رازی، قیدی[33] شیرازی، پیروی[34] ساوجی، کامی[35]

لہ بدایونی جلد سوم صفحہ ۱۸۶،

سبزواری، پیامی، سید محمد ہروی، قدسی کربلائی، حیدری تبریزی، سامری، قریبی شاپور، فسونی

شیرازی، نادری ترشیدی، نوعی مشہدی، بابا طالب اصفہانی، سرمدی اصفہانی، وخیل اصفہانی

قاسم ارسلان مشہدی، غیوری حصاری، قاسمی مازندرانی، رہی نیشاپوری،

یہ لوگ ہیں جو دربار میں پہونچے،

ابوالفضل ان ناموں کو لکھکر کہتا ہے "و آنانکہ سعادت بار نہ یافتند و از دور دستہا

گیتی خداوند را ستایشگر بس انبوہ، چوں قاسم گونابادی ضمیری سپاہانی، وحشی بافقی، محتشم

کاشی، ملک قمی، ظہوری ترشیزی، ولی دشت بیاضی، نیکی، صبری، فگاری حضوری، قاضی

نوری، صافی، طوفی طبریزی، رشکی ہمدانی، ان میں سے بھی بجز دو تین کے سب ہندوستان میں آئے تھے

اکبر و جہانگیر وغیرہ سلاطین خود صاحب مذاق اور نکتہ سنج تھے اس لئے شعرا فن شعر میں

ترقی کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس کے ساتھ چونکہ تقرب حاصل کرنے کی غرض سے ہر شاعر

دوسرے سے بڑھ جانا چاہتا تھا، اس لئے خود بخود ان سخن سنجوں کے کلام میں زور پیدا ہوجاتا

اور ہر ایک اپنے کلام میں کوئی نہ کوئی جدت پیدا کرتا تھا،

اکبر نے بارہا اساتذہ کے اشعار پر نکتہ چینیاں کیں، اور نقادانِ فن نے اسکی تنقید

کی داد دی، ایک دفعہ کسی نے فغانی کا یہ شعر پڑھا،

فغانی آفتاب من بدیں اعزاز می آید	مسیحا یار و خضرش ہمرکاب و ہم عناں عیسیٰ

اکبر نے برجستہ اصلاح دی، ع فغانی شہسوار من بدیں اعزاز می آید

جہانگیر کا ذوق شاعری اسی قدر صحیح تھا جس قدر ایک بڑے نقادِ فن کا ہوسکتا ہے

جس شاعر کی نسبت اُس نے جو کچھ لکھدیا ہے، اُس سے بڑھکر اس کے متعلق ریویو نہیں کیا جا سکتا

طالب آملی ایک مدت تک اس کے دربار میں شاعری کرتا رہا لیکن اُس نے ملک الشعرائی

کا خطاب اس کو اس وقت دیا جب وہ درحقیقت اس منصب کے قابل ہوا، چنانچہ خود لکھتا ہے ۔

"دریں تاریخ تخت نشینی کے چودھویں سال، طالب آملی بخطاب ملک الشعراء خلعت امتیاز پوشیدہ چوں رتبہ سخنش از ہمگناں درگذشت، در سلک شعرائے پایہ تخت منتظم گشت، ایں چند بیت از دست"

پھر چند شعر طالب آملی کے انتخاب کئے ہیں کہ خود طالب آملی اس سے اچھا انتخاب نہیں کر سکتا تھا،

ایک دفعہ خانخاناں نے یہ غزل طرح کی ع بہر یک گل زحمت صد خار می باید کشید، مرزا صفوی اور مرزا امرا دنے بھی اس طرح میں غزلیں لکھیں، طرح کا مصرع چونکہ نہایت شگفتہ تھا، جہانگیر نے فی البدیہہ یہ مطلع کہا،

ساغرے بر رخ گلزار[1] می باید کشید | ابر بسیار ست مے بسیار می باید کشید

طرح کا مصرعہ جامی کی غزل کا ہے، جہانگیر نے پوری غزل نکلوا کر دیکھی، لیکن چونکہ یہی ایک مصرعہ کام کا تھا، تزک میں لکھتا ہے:۔

"ایں مصرع ظاہر شد کہ از مولانا عبد الرحمٰن جامی ست، غزل او تمام بہ نظر درآمد غیر از اں مصرع کہ بطریق مثل زبان زد روزگار شدہ، دیگر کارے نساختہ بغایت سادہ و ہموار گفتہ[2]"

ایک دفعہ دربار میں امیر الامراء کا یہ شعر پڑھا گیا،

بگذر مسیح از سر ما کشتگان عشق | یک زندہ کردن تو بصد خون برابر ست

جہانگیر کے اشارے سے سب نے اس پر غزلیں لکھیں، جہانگیر نے ملا احمد مہر کن کا شعر پسند کیا،

---

[1] بر رخ گلزار یعنی گلزار کے سامنے [2] تزک جہانگیری مطبوعہ علی گڈھ ص۳۳۳،

چنانچہ یہ تمام واقعہ خود تزک میں لکھا ہے، جو حسب ذیل ہے،

بہ تقریبے ایں بیت امیر الامرا خواندہ شد ع بگذر مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق چوں

طبع من موزون ست گاہے بہ اختیار و گاہے بے اختیار مصراعے و رباعی، یا بیتے در

در خاطرم سر می زند، ایں بیت بر زبان گذشت[1]

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس ۔۔۔ یک دل شکستنِ تو بصد خوں برابر است

چوں خواندہ شد ہر کس کہ طبع نظمے داشت دریں زمین بیتے گفتہ گذرانید علی احمد

مہر کن کہ احوال او پیش ازیں گشت، بد نہ گفتہ بود،

اے محتسب ز گریۂ پیر مغاں بترس ۔۔۔ یک خم شکستنِ تو بصد خوں برابر است

فرہنگِ جہانگیری جب جہانگیر کے سامنے اس کے مصنف نے پیش کی تو جہانگیر نے

نہایت قدردانی کی، چنانچہ لکھتا ہے،

میر عضد الدولہ از آگرہ آمدہ ملازمت نمود، فرہنگے کہ در لغت ترتیب دادہ بنظر

در آورد، الحق محنت بسیار کشیدہ و خوب پیروی ساختہ و جمیع لغات را از اشعار علماء

قدما مستشہد آوردہ، دریں فن کتابے مثل ایں نمی باشد[2]،

ایک دفعہ[3] ایک شاعر نے جہانگیر کی مدح میں قصیدہ لکھکر پیش کیا، مطلع کا پہلا مصرع یہ تھا

ع ۔۔۔ اے تاجِ دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا

جہانگیر نے کہا تم عروض بھی جانتے ہو؟ شاعر نے کہا نہیں، جہانگیر نے کہا اچھا ہوا ورنہ

تمھارے قتل کا حکم ہوتا، پھر مصرع کی تقطیع کر کے بتایا کہ دوسرا رکن یہ آتا ہے "دلت بر سرت"

اور یہ سخت بے ادبی ہے،

---

[1] تزک جہانگیری ص ۱۱۱ [2] ایضاً ص ۳۵۹ [3] تذکرۂ سرخوش، ذکر جہانگیر،

اُس زمانے میں مُمی تخلّص ایک شاعر تھا جو قوم کا کلال تھا، کلالوں کی قوم شاہی دربار میں دربانی اور چاوشی کے لئے مخصوص تھی، مُمی نے بہ تقریب شاعری نورجہاں بیگم کے ذریعہ سے جہانگیر کے دربار میں رسائی پیدا کرنی چاہی، جہانگیر نے کہا کہ ان لوگوں کا کام چاوشی اور سواری کا اہتمام ہے، ان کو شاعری سے کیا مناسبت لیکن چونکہ نورجہاں کی خاطرِ عزیز تھی اجازت دی، مُمی نے یہ شعر پڑھا،

ممی بگریہ سرے وا ر دا ے نصیحت گر　　　کنارہ گیر کہ امروز روز طوفان ست

جہانگیر نے کہا دیکھا وہی اپنے پیشے کی رعایت دوسرے موقع پر پھر نورجہاں بیگم نے تقریب کی، مُمی نے مطلع پڑھا،

من میروم و برق زناں شعلۂ آہم　　　اے ہمنفساں دور شوید از سرِ راہم

جہانگیر نے ہنسکر کہا وہ اثر کہاں جا سکتا ہے[1]،

سلسلۂ سخن میں ہم کہاں سے کہاں نکل آئے، جہانگیر کی لائف لکھنی مقصود نہیں لیکن یہ دکھانا ہے کہ ان سلاطین کے دربار میں شعر و شاعری کی جو ترقی ہوئی، وہ صرف اسلئے نہ تھی کہ شاعری سے دولت ہاتھ آتی تھی بلکہ زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ یہ سلاطین خود موزوں طبع تھے، نقادِ فن تھے، اچھے بُرے کی تمیز رکھتے تھے، موقع بہ موقع شعرار کو ٹوکتے رہتے تھے، ان کو صحیح داد دیتے تھے، اسلئے ان کے دربار حقیقت میں شاعری کی تعلیم گاہ تھے،

دکن میں ابراہیم عادل شاہ کی قدردانی اور فیاضی نے بیجاپور کو ایران کا ٹکڑا بنا دیا تھا، ظہوری اور ملک قمی اس کے دربار کے ملازم تھے، اور اکبری کشش بھی ان کو دلی اور آگرے نہ کھینچ سکی، بُرہان پور میں نظام شاہ بحری گویا اس فن کا مربی تھا، ظہوری نے

---

[1] تذکرۂ سرخوش ذکر مُمی،

ساقی نامہ اسی کی شان میں کہا ہے، جس کا بیش بہا صلہ عطا ہوا،
ہندوستان کی یہی فیاضیاں تھیں جن کی بنا پر تمام ایران ادھر کھنچا چلا آتا تھا، خود شعراء کی زبان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے،

میرزا صائب

ہیچو عزم سفر ہند کہ در ہر دل ہست ۔۔۔ رقصِ سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

ابو طالب کلیم،

اسیر ہندم و زیں رفتنِ بیجا پشیمانم ۔۔۔ کجا خواہد رساندن پرفشانی مرغِ بسمل را
بہ ایران میرود نالاں کلیم از شوقِ ہمراہاں ۔۔۔ بپائے دیگراں ہمچوں جرس طے کردہ منزل را
زشوقِ ہند زاں ساں چشم حسرت بقفا دارم ۔۔۔ کہ روہم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را

علی قلی سلیم

نیست در ایران زمین سامانِ تحصیل کمال ۔۔۔ تا نیامد سوئے ہندوستاں حنا رنگیں نشد

دانش مشہدی

راہ دورِ ہند پابست وطن دارد مرا ۔۔۔ چوں حنا شب درمیان رفتن بہ ہندوستان خوشست

ہندوستان کی قوتِ کشش اس زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، ہمیشہ سے اس کی قدردانی کے شہرے ایرانیوں کے لئے دامِ تسخیر تھے، خواجہ حافظ کو بادشاہ بغداد نے بار بار بلایا لیکن جگہ سے نہ ہلے، شیراز ہی میں بیٹھے بیٹھے غزلیں لکھکر بھیجدیں، لیکن دکن سے تحریک ہوئی تو جہاز میں سوار ہوکر ہرمز تک آئے، جامی ایران میں تھے لیکن قصیدے ہندوستان میں بھیجتے تھے،

جامی اشعار دلآویز تو خیزے ست لطیف ۔۔۔ یو دش از حسن بود و زسر معنے تازش

ہمرہ قافلۂ ہند رواں کن کہ رسد　　شرفِ عزِ قبول از ملک التجارش

علی نقی کمرہ نے ۳۵ شعروں کا قصیدہ فیضی کی مدح میں لکھ کر بھیجا، جس میں کہتا ہے،

مرا افگند بر نظم اموردم پرتو فیضی　　ابوالفیض آں گزینِ اکبر و شیخ کبیرِ من

ہندوستان میں سلاطین اور شہزادوں کے علاوہ امراء اکثر سخن فہم اور قدرداں تھے ان میں ابوالفتح گیلانی اور عبدالرحیم خانخاناں نے شاعری کی اکاڈیمی (بیت العلماء) قائم کی جس کی بدولت شعراء نے اس فن میں نہایت ترقی کی، ابوالفتح ایک خط میں خانخاناں کو لکھتا ہے،

قصائدے کہ یاران آں جا گفتہ بودند شعرائے ایں جا فرمودہ شد بنام نامی شما ہرگاہ بہ اتمام می رسد بہ ملازمت فرستادہ خواہد شد، ملا عرفی و ملا حیاتی بسیار ترقی کردہ اند۔[1]

عبدالباقی مآثر رحیمی میں لکھتا ہے :۔

"اکثرے از اعیان دولت و ارکان سلطنت بادشاہ مرحوم (اکبر) دست گرفتہ و تربیت کردہ وے (حکیم ابوالفتح) اند و ہر کہ تازہ از ولایت آمدہ بندگی و مصاحبت ایشان اختیار می نمودہ چنانچہ خواجہ حسین ثنائی و میرزا قلی میلی و عرفی شیرازی و حیاتی گیلانی و سائر مستعداں در خدمت او بودہ اند"

شعر کی تاریخی زندگی میں یہ واقعہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں آکر فارسی شاعری نے ایک خاص جدت اختیار کی، جس کی تفصیل ہم کسی آئندہ موقع پر لکھیں گے، یہ جدت حکیم ابوالفتح کی تعلیم کا اثر تھا، مآثر رحیمی میں ہے،

ومستعداں و شعر سنجاں ایں زماں را اعتقاد آں ست کہ تازہ گوئی کہ دریں زماں

[1] چہار باغ فیضی مکاتیب حکیم ابوالفتح،

درمیانہ، شعرا مستحسن است و شیخ فیضی و مولانا عرفی شیرازی وغیرہ بہ آں روش حرف زدہ اند

بہ اشارہ و تعلیم ایشاں (حکیم ابوالفتح) بودہ (مآثر رحیمی تذکرۂ حکیم حاذق)

اسی طرح خانخاناں کی شاہانہ فیاضیوں اور شاعرانہ نکتہ سنجیوں نے شعر و شاعری کے حق میں ابر کرم کا کام دیا، خانخاناں نے احمد آباد میں ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا جس میں ہر فن کی نہایت نادر کتابیں جمع کیں، ایک عجیب خصوصیت اس کتب خانے کی یہ تھی کہ جس قدر مشہور شعرا اس کے دربار میں تھے ان کے دیوان خود اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کتب خانے میں محفوظ تھے، اکثر شعراء اس کتب خانے کی خدمت پر مامور تھے، یہیں غزلوں کی طرحیں دی جاتی تھیں، شعرا مشاعرے کرتے تھے، خانخاناں خود بھی شریکِ صحبت ہوتا تھا اور قدردانی سے دل بڑھاتا تھا، خود بھی ان طرحوں میں غزلیں کہتا تھا۔[1]

رسمی قلندر ایک ایرانی درویش شاعر تھا، اُس نے خانخاناں کی تربیت شعر و شعرا کا ذکر ایک قصیدے میں تفصیل سے کیا ہے، چنانچہ خانخاناں کو مخاطب کر کے کہتا ہے،

زیُمنِ مدحِ تو آں نکتہ سنج شیرازی (یعنی عرفی) ۔۔۔ رسید صیتِ کلامش بہ روم از خاور

بطرزِ تازہ ز مدحِ تو آشنا گردید ۔۔۔ چو روے خوب کہ یابد ز ماشطہ زیور

ز فیضِ نامِ تو فیضی گرفت چوں خسرو ۔۔۔ بہ تیغِ ہندی اقلیمِ سبعہ را یکسر

ز ریزہ چینیِ خوانت نظیریِ شاعر ۔۔۔ رسیدہ است بجائے کہ شاعرانِ دگر

کنند بہر مدیحش قصیدہ انشا (ق) ۔۔۔ کہ خونِ رشک چکد از دلِ سخن پرور

سوادِ شعرِ شکیبی چو کحلِ اصفاہاں ۔۔۔ بہ تحفہ سوے خراساں برند اہلِ نظر

ز مدحتِ تو حیاتی حیاتِ دیگر یافت ۔۔۔ بلے مقوی طبع عرض بود جوہر

حدیثِ نوعی و کفوی بیان چہ سازم من ۔۔۔ چو زندہ اند مدحِ تو تا دمِ محشر

[1] اس کتب خانہ کا حال مآثر رحیمی کے مختلف مقامات میں درج ہے،

زنعمت تو بہ نوعی رسید آں مایہ　　کہ یافت میر معزی ز نعمت سنجر

خانخاناں اس درجہ کا سخن سنج تھا کہ اگر وہ شاعری میں پڑتا تو عرفی اور نظیری کا ہمسر ہوتا اس طرح میں، چندست، پندست، فرزندست تمام مشہور شعرا نے زور آزمائیاں کی ہیں، نظیری اور خانخاناں کی غزلیں ہم بالمقابل درج کرتے ہیں، دونوں کا خود موازنہ کرو،

خانخاناں	نظیری
شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چندست	بحرف اہل غرض قرب و بعد ما بندست
جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومندست	دل شکستۂ ما را ہزار پیوندست
بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیگانہ ست	ازاں دمم کہ بحسرت فگندہ دیدن او
نگاہ اہل محبت تمام سوگندست	نگہ بگوشۂ چشم ہنوز در بندست
نہ دام دانم و نہ دانہ ایں قدر دانم	نظر دلیر نہ شد تا مژہ بہ پیش آمد
کہ پائے تا بسرش ہر چہ ہست دربندست	حجاب اگر پر کاہ ست کوہ الوندست
مرا فروخت محبت ولے ندانستم	دو چشم ساکن بیت الحزن من گروید
کہ مشتری چہ کس ست و بہائے من چندست	کہ من اسیر بمعشوقم و او بہ فرزندست
ادائے حق محبت عنایتی ست ز دوست	درازدستی حسن کہ گل بہ شبنم ریخت
وگرنہ خاطر عاشق بہیچ خرسندست	کہ تا بدامنم از جیب در شکر خندست
ازاں خوشم بہ سخنہائے دلکش تو چہ ہم	بہ کینہ جوئی افلاک عشق می بازم
کہ اندکے بہ اداہائے عشق مانندست	کہ ہر کہ دشمن ما شد بہ دست ما بندست

نظیری از تو بجان کندن ست لب بگشائے

بایں قدر کہ بگوئی بمیر خرسندست

دونوں غزلوں کے موازنہ کرنے کا یہ موقع نہیں لیکن صاحبِ ذوق سمجھ سکتا ہی کہ خانخاناں

کے کلام میں جو صفائی، شستگی، دلآویزی اور سوز وگداز ہے، نظیری کی غزل اس سے بالکل خالی

ہے، خانخاناں کی فیاضی اور قدر دانی سے جو شعراء اور اہلِ کمال اس کے دربار میں جمع ہو گئے

سلاطین کو بھی یہ بات نصیب نہیں ہوئی، مآثرِ رحیمی میں ان تمام شعراء کا مفصل تذکرہ ہے، عرفی

نے جب یہ قصیدہ پیش کیا ع

اے داشتہ در سایہ ہم تیغ و قلم را

تو ایک لاکھ روپیے دلوائے[1]

عرفی خانخاناں کی مدح میں خصوصیت کے ساتھ اپنے کمالِ سخن کی داد چاہتا ہے، کیونکہ

جانتا ہے کہ وہ خود اس فن کا حریف ہے، چنانچہ کہتا ہے،

علوِ پایۂ من در مقامِ سحبانی | سخن شناسا دیدی و دیدہ باشی ہم

بفضلِ خود چہ زنم لاف ہائے طولانی | فلاں مربی و من تربیت پذیر ایں بس

مربیانِ سخن کے سلسلہ میں قلی خاں، خانِ زماں، خانِ اعظم کوکلتاش، غازی خاں اور ظفر خاں

کا نام بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، خانِ زماں اکبری دربار کے امرائے کبار میں سے تھا،

جو بالآخر حریفِ سلطنت بن کر مارا گیا، وہ خود شاعر اور قدر دانِ سخن تھا، سلطان تخلص

کرتا تھا، چنانچہ بدایونی نے شعرائ کے ذیل میں اس کا حال لکھا ہے، اکثر شعراء اس کے دربار

میں ملازم تھے، ایک دفعہ جب اس نے یہ غزل لکھی،

گویا سرِ آں موست دہانے کہ تو داری | باریک چہ موے ست میانے کہ تو داری

تو اکثر شعرائے نے اس کا تتبع کیا، ایک شاعر نے یہ مطلع لکھا،

---

[1] کلمات الشعراء سرخوش ذکر خانخاناں،

گفتم کہ گمانے ست دہانے کہ تو داری
گفتا کہ یقین ست گمانے کہ تو داری

غزالی جب ایران سے دکن میں آیا، اور حسب دلخواہ اس کی قدر دانی نہیں ہوئی، تو خان زماں نے ہزار روپیے اور چند گھوڑے بھیج کر بلایا اور یہ قطعہ لکھ کر بھیجا،

اے غزالی بحق شاہ نجف
کہ سوے بندگان بیچوں آ

چوں کہ بے قدر گشتہ آں جا
سر خود گیر و زود بیروں آ

"سر خود گیر" سے ہزار روپیہ کا کنایہ تھا، کیونکہ غزالی کا پہلا حرف غ ہے جس کے عدد ہزار ہیں، غزالی دکن سے جون پور میں آیا اور جب تک خان زماں زندہ رہا اُس نے اور کسی دربار کی طرف رخ نہیں کیا، جون پور میں آکر اُس نے ایک مثنوی نقش بدیع لکھکر پیش کی جسمیں ایک ہزار شعر تھے، خان زماں نے وہ صلہ دیا جو سلطان محمود نہ دے سکا تھا، دفی شعر ایک اشرفی، اس مثنوی کے چند شعر اس لحاظ سے نقل کرتا ہوں کہ ناظرین خان زماں کی صحیح المذاقی کا اندازہ کر سکیں،

خاکِ دل آں روز کہ می بیختند
شبنمے از عشق برو ریختند

دل کہ بآں رشحۂ غم آلودہ شد
بود کبابے کہ نمک سودہ شد

بے اثر مہر چہ آب و چہ گل
بے نمک عشق چہ سنگ و چہ دل

ذوقِ جنوں از سر دیوانہ پرس
لذتِ سوز از دلِ پروانہ پرس

خان زماں کے مرنے کے بعد غزالی اکبر کے دربار میں آیا، اور ملک الشعراء کے خطاب سے ملقب ہوا، خاندان تیموریہ میں یہ پہلا شخص تھا جو اس منصب پر ممتاز ہوا،[1] الفتی یزدی خان زماں ہی کے دربار میں ملازم تھا،[2]

---

[1] خزانۂ عامرہ ذکر غزالی، [2] بدایونی جلد سوم تذکرہ الفتی ص ۱۸۹،

خان اعظم کوکلتاش اکبر کا رضاعی بھائی تھا، اور اس کے ساتھ کا کھیلا تھا، اکبر اسکی ناز برداریاں کرتا تھا، اور کہتا تھا، "چہ کنم درمیانِ من و خان اعظم دریاے شیر حائل ست"۔ خان اعظم نہایت قابل، نہایت نکتہ سنج اور بہت بڑا مورخ تھا، جہانگیر اس کی نسبت لکھتا ہے:-

"در علم سیر و فن تاریخ استحضار تمام داشت و در تحریر و تقریر بے نظیر بود، و در مدعا نویسی ید طولیٰ داشت، و در لطیفہ گوئی بے مثل بود و شعر ہموار ہی می گفت، این رباعی از واردات اوست"[1]

عشق آمد از جنوں برومندم کرد | وارستہ ز صحبت خردمندم کرد
آزاد ز بند دین و دانش گشتم | تا سلسلۂ زلف کسے بندم کرد

ملا بدایونی اس کی نسبت لکھتے ہیں:-

"بہ انواع فضائل و ہنر موصوف است و بفہم عالی و ادراک بلند او کسے دیگر را از امرا نشاں نمی دہند"

ملا صاحب نے اس کا ذکر شعرا کے ذیل میں کیا ہے، اور اس کے اشعار بھی نقل کئے ہیں ایک مطلع سننے کے قابل ہے،

گشت بیمار دل از رنج و غم تنہائی | اے طبیبِ دلِ بیمار چہ می فرمائی؟

خان اعظم نے اکثر شعرا کی تربیت کی جن میں سے جعفر ہروی، ہمتی، مدامی، بدخشی، معتمی، سبز واری کا ذکر بدایونی نے اپنی تاریخ میں کیا ہے،

میرزا غازی قندھاری صوبہ دار تھا، ایران کے شعرا جو کابل اور قندھار کی راہ سے ہندوستان میں آتے تھے، میرزا غازی ہی کے خوان کرم سے فیضیاب ہوتے تھے،

---

[1] تزک جہانگیری،

ظفر خاں صوبہ دار کشمیر اس رتبہ کا شخص تھا کہ کلیم اور مرزا صائب کو اس کی استادی اور مربی گری، کا اعتراف ہے، صائب ایک مدت تک اس کے دربار میں رہا اور اس کی بدولت شاعری میں ترقی کی، ظفر خاں اس کے کلام میں موقع بموقع دخل اور تصرف کرتا تھا، صائب نے اپنے دیوان کی ترتیب بھی اسی اشارے سے کی[1]، چنانچہ صائب ان باتوں کا احسان مندی کے ساتھ اعتراف کرتا ہے،

حقوقِ تربیتت را کہ در ترقی باد	زبان کجاست کہ در حضرتت فروخوانم
تو جان ز دخل بجا مصرع مرا دادی	تو در فصاحت دادی خطاب سحبانم
ز وقت تو بمعنی شدم چناں باریک	کہ می تواں بہ دل مور کرد پنہانم
چو زلف سنبل ابیات من پریشاں بود	نہ داشت طرۂ شیرازہ روئے دیوانم
تو غنچہ ساختی اوراق بادبردہ من	وگرنہ خار نمے ماند از گلستانم

صاحبِ مآثر الامراء ظفر خاں کے حال میں لکھتے ہیں،

زرہا بروم ایمان می داد خصوصاً در حق شعرا طرفہ بذل وکرم می فرمود سخنوران صاحب استعداد دل از اوطان برداشتہ روی امید بدرگاہش می گذاشتند ومبتہاے

---

[1] ظفر خاں کا نام احسن اللہ خاں اور احسن تخلص ہے ظفر خاں کا باپ خواجہ ابوالحسن سنہ ۱۰۳۲ھ میں جہانگیر کا وزیر اعظم مقرر ہوا اور کابل کی حکومت مستزاد ملی، ظفر خاں باپ کی نیابت میں کابل کا صوبہ دار ہو گیا، شاہجہاں نے ابوالحسن کو سنہ ۱۰۴۲ھ میں کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا، جب وہ اسی سنہ میں انتقال کر گیا تو ظفر خاں کشمیر کا مستقل حاکم مقرر ہوا، ظفر خاں نے اپنے ایام حکومت میں تبت کو فتح کیا، اور سنہ ۱۰۸۱ھ میں وفات پائی ظفر خاں صاحبِ دیوان ہے، ذیل کے شعر سے اس کی طبیعت کا اندازہ ہوگا،

دلم بکوے تو امیدوار می آید	نگاہ دار کہ روزے بکار می آید

تمنا می رسیدند، افصح المتاخرین میرزا صائب تبریزی چوں از ایران بہ کابل رسید از

گرمجوشی و دریا بخشی او دل بستہ محبتش گردیدہ"

ظفر خاں نے ایک عجیب مرقع تیار کرایا تھا جو آج ہاتھ آتا تو لاکھوں روپے کو ارزاں

تھا یعنی ایک بیاض تیار کرائی تھی جس میں ہر شاعر اپنا منتخب کلام خود اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا

اور صفحہ کی پشت پر اُس کی تصویر ہوتی تھی[5]،

اُس زمانے میں شاعری کی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ ہوا کہ مشاعروں کا رواج قائم ہوا،

اس سے پہلے شعرا (بطور خود، اساتذہ کی غزلوں پر غزل لکھتے تھے، اب (یعنی فغانی کے زمانے

سے) یہ طریقہ قائم ہوا کہ کسی امیر صاحب مذاق کے مکان پر شعرا جمع ہوتے تھے، پہلے سے کوئی طرح

دیدی جاتی تھی، سب اس طرح میں غزلیں لکھ کر لاتے تھے، اور پڑھتے تھے کبھی کبھی برسر محفل

دعویداروں میں چوٹ چل جاتی تھی، سوال و جواب ہوتے تھے اور اس طرح مسابقت اور

حریف پیشگی شاعری کو ترقی دیتی جاتی تھی،

ان تمام مجموعی حالات نے شاعری پر جو اثر کیا، اور جو خصوصیتیں پیدا کیں حسب ذیل ہیں،

(۱) غزل کی ترقی،

اگرچہ اس زمانے میں قصیدہ، مثنوی، غزل، رُباعی، ان تمام اصنافِ سخن کا بہت بڑا

ذخیرہ پیدا ہوگیا لیکن درحقیقت یہ عہد غزل کی ترقی کا عہد ہے، غزل میں مختلف اسٹائل (طرز)

قائم ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے،

واقعہ گوئی یا معاملہ بندی	یعنی اُن واقعات اور معاملات کا ادا کرنا جو عشق و عاشقی میں پیش آتے

ہیں، ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ واقعہ گوئی کے موجد سعدی ہیں، اور امیر خسرو نے اس پر معتدبہ اضافہ

[5] مآثر الامراء،

کیا لیکن اس عہد میں یہ ایک مستقل صنف ہوگئی جس کا بانی اوّل میرزا اشرف جہاں قزوینی ہے جو شاہ طہماسپ صفوی کا وزیر تھا، مولوی غلام علی آزاد خزانہ عامرہ میں لکھتے ہیں،

"چوں نوبت سخن سنجی بہ میرزا اشرف جہاں رسید طبع او مائل وقوع گوئی بسیار افتاد و ایں طرز را بحد کثرت رسانید"

شرف جہاں کا دیوان ہمارے کتب خانہ میں ہے، ہم اس سے اس کتاب کے چوتھے حصے میں کام لیں گے، یہاں ہم اس کے بعض اشعار اس غرض سے نقل کرتے ہیں کہ وقوع گوئی کا مفہوم سمجھ میں آسکے،

یا ہر کہ بنیمش چو بہ پرسم کہ کیست ایں | گوید کہ ایں ز عہد قدیم آشنائے ماست
نہاں از و بہ رخش داشتم تماشائی | نظر بجانب من کرد و شرمسار شدم
چناں گوید جوابِ من کزاں گردد رقیب آگہ | بمجلس گر من بیدل از و حرفے نہاں پرسم

شرف جہاں نے ۹۶۲ھ میں وفات پائی،

اس طرز کو جن لوگوں نے اپنا خاص موضوع بنالیا تھا وحشی یزدی، علی قلی میلی اور علی نقی کمرہ میں، وحشی یزدی چونکہ رند اور اوباش مزاج تھا اور بازاری معشوقوں سے اس کو زیادہ سروکار رہا، اس لئے اس طرز کو اُس نے کسی قدر اعتدال سے بڑھادیا، واسوخت کی ابتدا بھی اسی نے کی اور اسی پر اس کا خاتمہ بھی ہوگیا،

فلسفہ | غزل میں فلسفہ کی آمیزش عرفی نے خاص طور پر کی لیکن اس طرز کو بہت ترقی نہیں ہوئی، اس کے ہمعصروں اور مابعد کے شعرا نے بہت کم اس طرز میں کہا،

مثالیہ | یعنی کوئی دعویٰ کرنا اور اس پر شاعرانہ دلیل پیش کرنا اس طرز کے بانی کلیم علی قلی سلیم، میرزا صائب اور غنی ہیں، یہ طرز نہایت مقبول ہوا، یہاں تک کہ شاعری کے خاتمے

تک قائم رہا،

تغزل، تغزل سے یہ مراد ہے کہ عشق اور عاشقی کے جذبات موثر الفاظ میں ادا کئے جائیں یہ وصف اگرچہ لازمۂ غزل ہے لیکن نظیری نیشاپوری، حکیم شفائی اور علی نقی نے اس کو زیادہ نمایاں کیا، ان لوگوں میں اور وقوع گویوں میں یہ فرق ہے کہ وقوع گو شعرا ہوس پرست اور بازاری معشوقوں کے عاشق ہوتے ہیں، اور اُسی قسم کے واقعات اور خیالات باندھتے ہیں، بخلاف اس کے متغزلین کا معشوق شاہد بازاری نہیں ہوتا، اور نہ ان کا عشق مبتذل اور اوباشانہ ہوتا ہے،

خیال بندی اور مضمون آفرینی، یہ وصف تمام متاخرین میں ہے لیکن اس طرز خاص کا نمایاں کرنے والا جلال اسیر ہے، جو شاہجہاں کا ہمعصر ہے، شوکت بخاری، قاسم دیوانہ وغیرہ نے اس کو زیادہ ترقی دی، اور ہمارے ہندوستان کے شعرا بیدل و ناصر علی وغیرہ اسی گرداب کے تیراک ہیں،

قصیدہ، قصیدہ کا ایک خاص طرز عرفی نے قائم کیا، جس کی کوئی تقلید نہ کر سکا، ظہوری، طالب آملی، حسین ثنائی نے بھی اس صنعت کو کچھ کم ترقی نہیں دی،

مثنوی، مثنوی بالکل اپنے درجے سے گر گئی (فیضی اس سے مستثنیٰ ہے) مثنوی میں عموماً تاریخی واقعات یا اخلاقی مضامین ادا کئے جاتے ہیں لیکن ان مضامین کے لئے سادگی اور پختگی درکار ہے، متاخرین ہر بات میں رنگینی کے عادی ہو گئے تھے، اس لئے مثنوی، مثنوی نہیں رہی، بلکہ غزل بن گئی، کلیم کا شاہجہاں نامہ منظوم پڑھو رزم لکھتے ہیں، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ بزم نشاط میں گانا ہو رہا ہے،

رُباعی، یہ زمانہ اس امتیاز پر ناز کر سکتا ہے کہ رُباعی نے فلسفہ کے تمام مسائل ادا

ادا کر دیئے، سحابی استرآبادی جو اکبر کا ہمعصر اور نجف میں معتکف تھا، اس نے کم از کم سترہ ہزار رباعیاں لکھیں جو سرتاپا فلسفہ سے مملو ہیں، اس کا ایک انتخاب جس میں سات ہزار رباعیاں ہیں، ہمارے پاس ہے، اور ہم شعر العجم کے چوتھے حصہ میں جہاں فلسفیانہ شاعری پر بحث کریں گے، اس کے کلام کا انتخاب پیش کریں گے، یہ تمام تفصیل خاص خاص انواع شاعری کے متعلق تھی، عام طور پر طرز ادا اور اسلوب بیان میں جو جدتیں پیدا ہوئیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) قدما اور متوسطین کسی خیال کو پیچیدگی سے نہیں ادا کرتے تھے، متاخرین کا یہ خاص انداز ہے کہ جو بات کہتے ہیں پیچ دے کر کہتے ہیں، یہ پیچیدگی زیادہ تر اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ جو خیال کئی شعروں میں ادا ہو سکتا ہے اس کو ایک شعر میں ادا کرتے ہیں مثلاً قدسی کہتا ہے،

عیش ایں باغ باندازۂ یک تنگ دلست　　کاش گل غنچہ شود تا دل ما بکشاید

مطلب یہ ہے کہ دنیا کا باغ ایک نہایت مختصر باغ ہے، اس میں اسی قدر وسعت ہے کہ صرف ایک تنگ دل آدمی خوش ہولے اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ میرا دل بھی شگفتہ ہو، اور پھول کی کلی بھی کھل سکے، اس بنا پر آرزو کرتا ہے کہ کاش پھول کلی بن جائے، تاکہ میرے دل کی شگفتگی کی گنجایش نکل سکے، اس مضمون کو فلسفیانہ نظر سے دیکھیں تو یہ خیال ادا کرنا مقصود ہے کہ دنیا میں جب کسی کو فائدہ پہونچتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دوسرے کو نقصان پہونچا کسی بادشاہ نے ملک فتح کیا یعنی دوسرے کو شکست ہوئی، یہ خیال کسی حیثیت سے دیکھا جائے ایک شعر میں سمانے کے قابل نہ تھا، اس لئے جب ایک ہی شعر میں اس کو ادا کرنا چاہا تو خواہ نخواہ پیچیدگی پیدا ہو گئی،

کبھی یہ پیچیدگی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ کوئی مبالغہ یا استعارہ یا تشبیہ نہایت دور از کار ہوتی ہے، اس لئے سننے والے کا ذہن آسانی سے اُس کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا، مثلاً

شوکت بخاری کہتا ہے،

گوش ہا را آشیانِ مرغِ آتش خوارہ کرد　　　برقِ عالم سوز یعنی شعلۂ غوغاے من

شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے جو آہیں کیں اس قدر گرم تھیں کہ اس سے شعلے نکلے، یہ شعلے لوگوں کے کانوں میں پہونچے، یہانتک کہ لوگوں کے کانوں میں آگ بھر گئی، اس بنا پر مرغ آتش خوار نے جس کی غذا آگ ہے، کانوں میں اپنا گھونسلا بنا لیا کہ ہر وقت غذا ملتی رہے،

چونکہ کسی شخص کا ذہن اس طرف نہیں جا سکتا کہ آہ کی گرمی سے کان آتش کدے بنجائیں گے اس لئے مضمون آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا،

(۲) اس زمانے کے اکثر مضامین کی بنیاد الفاظ پر اور صنعتِ ایہام پر ہے یعنی لفظ کے لغوی معنی کو ایک حقیقی بات قرار دیکر اس پر مضمون کی بنیاد قائم کرتے ہیں، مثلاً

امروز نیم شہرۂ عالم ز ضعیفی　　　عمریست کہ از ضعف فتادم بزبانہا

"بر زبان افتادن" کے اصطلاحی معنی مشہور ہونا ہے، لیکن لغوی معنی "زبان پر پڑنا" ہے مضمون کی بنیاد اسی لغوی معنی پر ہے کہتا ہے کہ کمزوری اور ضعف میں میں کچھ آج سے مشہور نہیں، ایک مدت ہو کہ میں زبانوں پر چڑھ گیا ہوں، زبان پر پڑنے کے معنی چونکہ اصطلاح میں مشہور ہونے کے ہیں، اس لئے یہ دعوی صحیح ہے، لیکن شاعر لغوی معنی لے کر ضعف کو یوں ثابت کرتا ہے، کہ میں اس قدر ضعیف ہوں کہ لوگوں کی زبانوں پر چڑھا پھرتا ہوں،

متاخرین کی شاعری سے اگر ایہام کو الگ کر دیا جائے، تو اُن کی شاعری کا بہت بڑا حصہ دفعۃً برباد ہو جائے گا،

(۳) اس دور کا بڑا امتیازی وصف، استعارات کی نزاکت اور جدتِ تشبیہ ہے، تمدن کی ترقی میں جس طرح تمام اسباب معاشرت و تمدن میں تکلفات پیدا ہو جاتے ہیں، اسی طرح زبان اور خیالات میں بھی نزاکت اور تکلفات پیدا ہو جاتے ہیں، مثلاً آنکھیں فرشِ راہ ہیں گو بجائے خود اچھا استعارہ ہے، لیکن **نظیری** کہتا ہے،

می خواست بوسہ رخت اقامت بگسترد ۔۔۔ از فرشِ جبہ راہ بر آں خاک کوئے نبود

بوسہ چاہتا تھا کہ بستر ڈالے، لیکن اس کی گلی میں اس قدر پیشانیوں کا فرش بچھا ہوا تھا کہ جگہ نہ تھی"

یا مثلاً شانی کہتا ہے:۔

شانی دلت بکج کلہاں مائل ست باز ۔۔۔ ایں لالہ را بطرفِ کلاہِ کہ می زنی

یعنی اے شانی تیرا دل کج کلاہوں پر مائل ہو رہا ہے، اس پھول کو کس کی ٹوپی میں لگانا چاہتا ہے،

استعارات کی جدت و نزاکت، متاخرین کا عام انداز ہے لیکن اس وصف میں طالب آملی سب سے زیادہ ممتاز ہے،

(۴) اس زمانے میں الفاظ کی نئی تراشیں اور نئی نئی ترکیبیں کثرت سے پیدا ہوئیں، مثلاً پہلے میکدہ، آتشکدہ وغیرہ مستعمل تھے، اب نشترکدہ، مرہم کدہ وغیرہ ترکیبیں پیدا ہوئیں یا مثلاً پہلے یک گلشن، یک چمن گل کہتے تھے، اب یک خندہ لب، یک آغوش گل، یک دیدہ نگاہ وغیرہ کہنے لگے، اس قسم کی ترکیبیں عرفی، فیضی، نوعی نے کثرت سے پیدا کیں، ان

ترکیبوں سے اکثر جگہ مضمون کا اثر بڑھ جاتا ہے، مثلاً

ع شکن بر روی شکن خم بر روی خم چنید

ع موج بر موج شکستم چو بہ عماں رفتم

ع بہر یک لب خندہ نتواں منتِ شادی کشید،

ع روے بر تنے حسن کن دست بدستِ ناز دہ

اس سے زیادہ یہ کہ ایک بڑا خیال ایک چھوٹے سے لفظ سے ادا ہو جاتا ہے، مثلاً یہ شعر

حریفِ سخت کمانے کہ در کمین وے ارم ۔۔۔ بہ دور گردی من از غرور می خندد

کہنا یہ تھا کہ میں معشوق سے محبت کرتا ہوں لیکن الگ الگ ہٹتا ہوں کہ تیر عشق کا

گھائل نہ ہو جاؤں لیکن معشوق میرے اس کترائے پھرنے پر ہنستا ہے کہ میری زد سے بچکر

کہاں جائیگا، اس خیال کے ادا کرنے کے لئے دورگردی کا لفظ نہ ہو تو ایک شعر میں

یہ مطلب ادا نہیں ہو سکتا تھا،

چونکہ ان تمام خصوصیات کی زیادہ تفصیل ان شعرا کے کلام کے ذیل میں آئے گی، جن کے

ہاں یہ خصوصیات زیادہ پائے جاتے ہیں، اس لئے اس موقع پر ہم اس گرہ کو زیادہ نہیں کھولتے،

فغانی شیرازی

تمام اہلِ فن اور اربابِ تذکرہ کا اتفاق ہے کہ متوسطین کی شاعری میں انقلاب پیدا ہو کر جو نیا دور قائم ہوا جو متاخرین اور نازک خیالیوں کا دور کہلاتا ہے، اس کا بانی فغانی ہے لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ ایسے شخص کے حالات بھی اربابِ تذکرہ دو چار سطر سے زیادہ لکھنا گوارا نہیں کرتے، بہر حال ایک ایک نکتہ کا سراغ لگا کر جو سرمایہ ہاتھ آیا ہے وہ نذرِ احباب ہے،

فغانی کا وطن شیراز ہے، سام میرزا نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ پہلے چاقو بنایا کرتے تھے، شاعری کا آغاز تھا کہ ہرات میں آئے، اُس زمانہ میں شاعری کا جو انداز مقبولِ عام تھا، سلطان حسین مرزا کے شعرا کا انداز تھا، چونکہ فغانی کا رنگ ان سے الگ تھا، اس لیے کسی نے ان کی قدر نہ کی، بلکہ ان کے کلام کو اس قدر لغو سمجھتے تھے کہ جب کسی کا کوئی مہمل شعر پڑھا جاتا تھا، تو کہتے تھے فغانیہ[1] ہے، جامی اس وقت تک زندہ تھے، فغانی ان سے ملے لیکن اُن سے بھی فغانی کو داد نہ ملی، بالآخر تبریز میں آئے، یہاں سلطان یعقوب فرماں روا تھا، اس نے ان کی نہایت قدردانی کی، چنانچہ انھوں نے اس کی مدح میں قصیدے لکھے جو دیوان میں موجود ہیں، سلطان نے ان کو بابا کا خطاب[2] دیا، سلطان یعقوب کے

[1] تذکرہ عرفات اوحدی [2] ید بیضا

انتقال کے بعد ابیورد میں آکر قیام کیا،

نہایت لاابالی مزاج اور رند تھے، شراب حد سے زیادہ پیتے تھے، اکثر میخانوں میں گذرتی تھی، اسی بنا پر ابیورد کے حاکم نے ان کا روزینہ شراب اور گوشت مقرر کر دیا تھا، اخیر عمر میں توبہ کی، اور مشہد میں معتکف ہو گئے، ۹۲۵ھ میں وفات پائی،

شروع میں جب اپنے بھائی کی دوکان میں چھری بنایا کرتے تھے تو اس مناسبت سے سکاکی تخلص[1] رکھا تھا، پھر فغانی رکھا،

ان کا دیوان ایک لڑائی کے ہنگامہ میں ضائع ہو گیا تھا، بھائی کو خط لکھا کہ جہاں کہیں سے جو کچھ مل سکے جمع کرو، چنانچہ جگہ جگہ سے تلاش کر کے وہ مجموعہ مرتب ہوا جو آج موجود ہے، لیکن اصل مرتب شدہ دیوان جاتا رہا،

کلام پر رائے	ان کو تمام اہل سخن مجدد فن مانتے ہیں، والہ داغستانی لکھتے ہیں،

بابائے مغفور مجتہد فن تازہ ایست کہ پیش از وے احدی آں روش شعر نہ گفتہ و پایہ سخنوری را بجائے رسانیدہ کہ عنقائے اندیشہ پیرامون او نمی تواند پرید، اکثر استادان زمان مولانا وحشی یزدی و مولانا نظیری نیشاپوری و مولانا ضمیری صفاہانی و خواجہ حسین ثنائی و مولانا عرفی شیرازی، و حکیم شفائی، اصفہانی و حکیم مسیحا کاشی و مولانا محتشم وغیرہم تبیع و معتقد و شاگرد و خوشہ چین خرمن طرز و روش اویند"

متاخرین کی جو خصوصیتیں ہیں، ان کو ہم تمہید میں لکھ چکے ہیں، فغانی کے کلام میں وہ خصوصیتیں متوسط حد تک موجود ہیں، ورنہ اصلی ترقی عرفی، نظیری، شرف قزوینی وغیرہ نے دی ہے، ہم صرف کلام کے نمونے پر اکتفا کرتے ہیں،

---

[1] عرفات اوحدی

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست — بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

ای کہ می گوئی چرا جامے بجانے می خری — ایں سخن با ساقیِ ماگو کہ ارزاں کردہ است

طرز ادا کا لطف دیکھو، معترض کو یہ اعتراض تھا کہ شراب ایسی کیا چیز ہے جو جان کے عوض میں خریدی جائے، لیکن اس نے اختصار کے لئے صرف اس قدر کہا کہ تم ایک پیالہ جان کے عوض میں کیوں خریدتے ہو، مے خوار شراب کے لطف کا اس قدر گرویدہ ہے کہ وہ یہ سمجھا کہ اعتراض اس پر ہے کہ شراب اتنی ارزاں کیوں خریدتے ہو، اس کی قیمت تو جان سے بڑھ کر کوئی چیز دینی چاہئے، اس کا جواب دیتا ہے کہ میں کیا کروں، یہ اعتراض تو ساقی پر کرنا چاہئے، اس نے قیمت گھٹا کیوں دی،

بدگفتنِ من شد ہنرِ حاسدِ منکر — صد شکر کہ عیبم ہنرِ بے ہنراں است

خراب آں کمر نازکم کہ چوں مہِ نو — بہ شیوہ ہائے بلند از میاں زمیں پیداست

ساقی مدام بادہ باندازہ می دہد — ایں بیخودی گناہِ دلِ زود مستِ ماست

آں کہ ایں نامۂ سربستہ بنشت است نخست — گرہے سخت بسر رشتۂ مضموں زدہ است

مشکل حکایتیست کہ ہر ذرہ عین اوست — اما نمی تواں کہ اشارت باو کنند

بروں خرام کہ بسیار شیخ و دانشمند — خراب آں شکن طرہ و بنا گوشند

مقصود صحبت است زگل ورنہ بوے گل — انصاف اگر بود ز صبا می تواں شنید

آلودۂ شراب فغانی بہ خاک رفت — آہ ار ملائکش کفنِ تازہ بو کنند

تا می تواں شکستہ دلِ دوستاں مخواہ — کیں خانہ را بہ کعبہ مقابل نہادہ اند

درماندۂ صلاح و فسادیم الحذر — زیں رسمہا کہ مردم عاقل نہادہ اند

با آہ و نالہ گرچہ سر آمد زمانِ وصل — از نقدِ عمر آں دو نفس در حساب بود

هزاران چاره ضائع گشت و یک دم نشد ساکن — کنوں صد دگر از پہلوے ہر چارہ دارم

تو اے گل بعد ازیں با ہر کہ می خواہد دلت بنشیں — کہ من چوں لالہ با داغِ جفایت زیں چمن رفتم

وے می باید صبرے کہ آرد تابِ دیدارش — فغانی گر دلے داری تو باش اینجا کہ من رفتم

از فریبِ نقش نتواں خامۂ نقاش دید — ورنہ دریں سقفِ رنگیں جز یکے در کار نیست

ملک الشعراء فیضی

(تولد ۹۵۴ھ، وفات ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ)

فارسی شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو شخص پیدا کئے، جن کو اہلِ زبان کو بھی چار و ناچار ماننا پڑا، خسرو اور فیضی، میرزا صائب فیضی کی طرح پر غزل کہتے ہیں، اور مقطع میں کہتے ہیں،

این آں غزل کہ فیضیٔ شیریں کلام گفت | در دیدہ ام خلیدہ در دل نشستہ،

علی نقی کمرہ، ایران کے مشہور شاعر نے ایک قصیدہ ۳۵ شعروں کا فیضی کی مدح میں اصفہان سے لکھکر بھیجا جس کے چند شعر یہ ہیں[1]،

مرا فگند بر نظم امورم پرتوِ فیضی | ابوالفیض آں گزینِ اکبر و شیخ کبیرِ من
اگر ہستم مجیر اندر سخن او ہست خاقانی | وگر من ہستیر آستانِ او مجیر من
یکیم با او رسد در شاعری دعوائے ہمچشمی | کہ دریں خانقاہم من مرید و اوست پیر من

افسوس یہ ہے کہ شاعری کی شہرت نے فیضی کے اور تمام کمالات پر پردہ ڈال دیا، وہ کہتا ہے اور سچ کہتا ہے،

امروز نہ شاعرم حکیم | دانندۂ حادث و قدیم

لیکن شاعری کی شہرتِ عام اور تصنیفاتِ علمی کی گمشدگی نے اس دعوی کو بے دلیل

---

[1] سرو آزاد

کر دیا۔ فیضی کے مذہبی اور علمی خیالات کا برائے نام کچھ پتہ چلتا ہے، تو ان اتہامات سے جو بدایونی نے نہایت بے دردی سے اس پر لگائے ہیں تاہم ایک نکتہ داں کو اس غلط اور جھوٹی تصویر میں بھی اصلیت کے خد و خال نظر آتے ہیں لیکن ابھی ان بحثوں کے چھیڑنے کا موقع نہیں ابھی اس کے سرسری حالاتِ زندگی سننے چاہئیں،

فیضی عربی النسل ہے، اسلاف یمن میں رہتے تھے، شیخ موسیٰ جو فیضی کی پانچویں پشت میں ہیں، وطن سے ترک تعلق کرکے سیاحت کو اٹھے اور چلتے پھرتے سندھ کے علاقے میں آئے ریل ایک قصبہ ہے، یہاں قیام کیا، اور شادی کر لی، دسویں صدی ہجری میں خضر فیضی کے دادا وطن چھوڑ کر ناگور میں آئے یہاں ایک عربی خاندان میں شادی کی جس سے شیخ مبارک پیدا ہوئے فیضی اسی نخلِ کمال کا نونہال تھا، شیخ مبارک بڑے پایہ کا شخص تھا، علوم ظاہری اور باطنی دونوں میں کمال رکھتا تھا، چار جلدوں میں تفسیر کبیر کے انداز پر ایک تفسیر لکھی جس کا نام منبع العیون رکھا، نہایت سیر چشم اور قانع تھا، شیر شاہی حکومت میں سلطنت کی طرف سے جاہ و عزت کی ترغیبیں دلائی گئیں لیکن اسکی چشم استغنا نے نظر اٹھا کر نہ دیکھا، اُن کے مفصل حالات ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھے ہیں،

شیخ مبارک ناگور سے گجرات اور گجرات سے آگرہ میں آئے جمنا کے کنارے میر رفیع الدین حسینی کے ہمسایہ میں قیام اختیار کیا، اور یہیں ایک معزز خاندان میں شادی کی، خدا نے کثرت سے اولاد دی، جس میں سب سے پہلا فیضی تھا، جو ۹۵۴ھ میں پیدا ہوا، فیضی نے ابتدائی اور انتہائی تعلیم باپ سے حاصل کی،

بدایونی نے خواجہ حسین مروی کے حال میں لکھا ہے کہ فیضی اُس کا تربیت یافتہ تھا، خواجہ حسین مروی، شیخ علاء الدولہ سمنانی کے خاندان سے تھے معقولات میں ملا عصام الدین

کے شاگرد تھے، دینیات شیخ ابن حجر مکی سے حاصل کی تھی، شاعری، انشا پردازی حسن تقریر اور ظرافت و لطیفہ گوئی میں کمال رکھتے تھے، اکبر کے حکم سے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ نظم میں کرنا شروع کیا تھا ۹۸۶ھ میں وفات پائی فیضی نے دامِ ظلمہ سے مادہ تاریخ نکالا،

بدایونی نے نہیں لکھا کہ فیضی نے کس فن میں ان سے تربیت پائی تھی لیکن غالباً یہ شاعری کا فن ہوگا، شباب کو پہنچا تو اس کا دامن کمالات کے پھولوں سے بھرا تھا لیکن قسمت نے مدتوں عجیب عجیب مصیبتوں میں مبتلا رکھا جس کی داستان نہایت لمبی ہے لیکن چونکہ دلچسپ بھی ہے اس لئے بالکل قلم انداز بھی نہیں کر سکتا،

شیخ مبارک کو وسعت نظر اور ہمہ داں ہونے نے تقلید اور تعصب کی بندشوں سے آزاد کر دیا تھا خود حنفی تھا لیکن شیعی، سنی، مسلمان کا فرسب سے ملتا تھا، اس زمانہ میں مہدوی فرقہ نہایت مطعون خلائق تھا، شیخ کو ان سے ملنے میں بھی دریغ نہ تھا، عوام میں شہرت پھیلی کہ شیخ رافضی ہے، مہدوی ہے، دہری ہے، حسن اتفاق یہ کہ انہی زمانے یعنی ۹۷۴ھ میں کہ اکبر کی سلطنت کا چودھواں برس تھا شیخ گوشہ عزلت سے نکل کر افادۂ عام کی مسند پر بیٹھا اکبر اس زمانہ تک متعصب مولویوں کے قبضہ میں تھا، اس کے بل پر درباریوں کو شیخ کے ستانے کا موقع ملا، ان میں سے ایک شخص آدھی رات کے وقت ہانپتا کانپتا فیضی کے پاس آیا کہ امرائے دولت سب کے سب آپ کی مخالفت پر کمر بستہ ہیں مصلحت یہ ہے کہ شیخ کو لیکر کہیں نکل جائیے جب یہ فتنہ فرو ہو جائے تو پھر دفعتاً ہے فیضی گھبرایا ہوا باپ کے پاس آیا شیخ مبارک نے بڑے استقلال سے جواب دیا کہ میں جگہ سے نہیں ہلتا، جو ہونا ہے ہوگا، فیضی

لہ آئین اکبری میں یہی سنہ ہے لیکن تعجب ہے کہ خود ابوالفضل نے اکبرنامہ میں فیضی کے اول مرتبہ دربار میں پہونچنے کو بارہویں سال کے واقعات میں بیان کیا ہے،

اس قدر رعو اس پاغتہ تھا کہ طوانہ نکال کر کہا آپ کو اختیار ہے چلئے یا نہ چلئے ہیں تو اپنے آپ کو ہلاک کئے ڈالتا ہوں،

باپ کو محبت نے مجبور کیا ابوالفضل کو سوتے سے جگایا، تینوں باپ بیٹے گھر سے نکل کھڑے ہوئے لیکن کچھ معلوم نہ تھا کہ کہاں جاتے ہیں، چلتے چلتے فیضی کو ایک آشنا کا خیال آیا، اس کے گھر پہنچے، وہ ان لوگوں کو دیکھ کر سخت گھبرایا، مکان کے اندر گئے تو وحشت کدہ دیکھا، وہاں سے بھی چل کھڑے ہوئے، ابوالفضل نے واپس چلنے کی رائے دی لیکن فیضی نے نہ مانا، ایک شخص کا نام لیا کہ اس کے یہاں ضرور امن ملے گا، غرض اُس کے گھر پہونچے، اُس نے نہایت گرمجوشی کا اظہار کیا، دو دن یہاں ٹھہرے، ادھر مخالفوں نے اکبر کو برہم کرکے فرمان شاہی صادر کرایا تھا، کہ شیخ مبارک کا سارا خاندان دربار میں حاضر کیا جائے، شاہی چوبدار شیخ مبارک کے گھر پہنچے اور چاروں طرف پہرے بیٹھ گئے، ابوالخیر[1] فیضی کا چھوٹا بھائی گھر میں تھا، اس کو پکڑ کر بادشاہ کے سامنے لے گئے، شیخ کے دشمنوں کو اکبر کے بھڑکانے کا موقع ملا کہ شیخ کے دل میں چور نہ ہوتا تو روپوش کیوں ہو جاتا، اکبر کو مخالفوں کی سختی اور جوشِ انتقام دیکھ کر رحم آیا، درباریوں سے کہا ایک غریب گوشہ نشین کی جان کا دشمن بننا کیا ضرور ہے، شیخ اکثر سیر کو نکل جاتا ہے اس وقت بھی کہیں چلا گیا ہوگا، اس بیچارے لڑکے (ابوالخیر) کو کیوں پکڑ لائے ہو، غرض ابوالخیر چھوڑ دیا گیا، اور پہرہ بھی اُٹھ گیا،

دشمنوں نے اب بادشاہ کی زبان سے جھوٹی خبریں مشہور کرنی شروع کیں کہ شیخ مبارک و فیضی معتوبانِ بارگاہ ہیں، چند روز کے بعد صاحب خانہ نے بے اعتنائی شروع کی،

---

[1] اکبر نامہ میں اس واقعہ کی تاریخ ۲۰ ربیع الاول ۹۸۲ھ بیان کی ہے،

شیخ کو کھٹکا ہوا کہ خود صاحب خانہ کہیں پکڑوا دے، رات کو بے سرو سامانی کے ساتھ وہاں سے نکلے، اتفاق سے ایک شاگرد راہ میں مل گیا، اُس نے لیجا کر مہمان رکھا لیکن اس کی طرف سے بھی اطمینان نہ تھا، بالآخر یہ رائے ٹھہری کہ اس شہر سے نکل جانا چاہئے، فیضی بھیس بدل کر نکلا اور ایک امیر کے پاس جس سے قدیم ملاقات تھی گیا، اُس نے میزبانی کو اپنا فخر سمجھا، کچھ ترک جوان ساتھ کر دیئے کہ شیخ کو ساتھ لائیں، آدھے بجے فیضی نے جاکر باپ بھائی کو یہ مژدہ سنایا، سب نے بھیس بدلے اور غیر معروف راستوں سے امیر کے پاس پہنچے، دس دن تک یہاں اطمینان سے گذرے لیکن دشمنوں نے امیر کو دربار میں پکڑ بلوایا، مجبوراً یہاں سے بھی نکلنا پڑا، چلتے چلتے ایک باغ نظر آیا، ٹھہر گئے کہ ذرا آرام لے لیں، بدقسمتی سے جاسوسوں کا ایک گروہ جو شیخ کی تلاش میں ہر طرف پھرتا تھا، باغ کے پاس اترا ہوا تھا، یہاں سے بھی گھبرا کر نکلے راستہ میں ایک باغبان نے پہچانا، اور دلدہی کر کے اپنے گھر لے گیا، باغبان کا آقا باہر سے آیا تو اُس نے شیخ سے شکایت کی کہ میرے ہوتے آپ نے کیوں اس قدر تکلیف اُٹھائی، چونکہ شیخ کے قیافے سے بے اطمینانی ظاہر ہوتی تھی، اس نے چوہ گھر میں لیجا کر رکھا کہ آپ اطمینان سے رہئے، مہینے سے کچھ اوپر یہاں قیام کیا،

چونکہ اکبر اس زمانے میں فتحپور میں رہتا تھا، فیضی آگرہ سے فتحپور گیا کہ ان مصیبتوں سے بچنے کی کوئی تدبیر نکالے لیکن قسمت کی گردش یہاں بھی ساتھ تھی، فیضی نے جب اپنی مظلومی کی داستان سنائی، تو درباریوں میں سے ایک نیک دل امیر کو اس قدر جوش آیا کہ اسی وقت اُٹھا اور دربار میں بغیر اس کے کہ شاہی آداب بجا لائے، گستاخانہ لہجے میں کہا کہ اس ظلم کی کچھ انتہا ہے، اکبر نے کہا خیر ہے؟ امیر نے کیفیت بیان کی، اکبر نے کہا تم کو خبر بھی ہے؟ تمام علما نے فتوے تیار کئے ہیں، اور مجھ کو چین لینے نہیں دیتے کہ جہاں سے ہو شیخ مبارک

کا خاندان ڈھونڈھ کر پیدا کیا جائے اور اُس کو سزا دیجائے، مجھکو شیخ کا قیام گاہ معلوم ہے یہ

کہکر اکبر نے خاص چہرہ محل کا پتہ دیا، جہاں شیخ کا قیام تھا، لیکن دانستہ ٹالتا ہوں، کل کوئی

جاکر شیخ کو دربار میں لائے،

فیضی یہ واقعہ سن کر بہت گھبرایا، راتوں رات گرتا پڑتا باپ کے پاس آیا، اسی وقت

سب نے بھیس بدلے، اور گھر سے نکلے جس مصیبت اور پریشانی میں گھر سے نکلے ہیں اسکی تصویر

ابوالفضل نے ان لفظوں میں کھینچی ہے،

"نورستان آفتاب بتاریکجائے بدگوہر، و ہجوم مسالکِ شہر و ہنگامہ پژوہندگانِ نافرجام

و بادر ناپدید، و بار اندازِ نایافت قلم چوبیں راچہ یارا کہ قدرے ازاں حال گذارد"

غرض ایک ویرانے میں جاکر پناہ لی، چونکہ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ بادشاہ اپنی ذات سے

مہربان ہے، اس لئے یہ رائے ٹھہری کہ پائے تخت میں چل کر بادشاہ تک رسائی کے سامان پیدا

کئے جائیں، ایک امیر سے پرانی ملاقات تھی، اس کے پاس گئے، اس نے کہا کہ پہلے آتے

تو معاملہ آسان تھا، اب حضور کے دل میں بھی رنج آگیا ہے، یہاں رہنا کسی طرح مناسب

نہیں، یہ کہکر گاڑی منگوائی اور اس میں بٹھا کر ایک گاؤں میں بھجوا دیا، وہاں پہونچ

کر معلوم ہوا کہ گاؤں کا رئیس اس خاندان کا قدیمی دشمن ہے، غرض یہاں سے بھی نکلے

اور ایک اور گاؤں میں پہونچے،

یہاں بھی ایک مفسد کا سامنا ہوا، اب پھر پھرا کر آگرے میں آئے، اور ایک دوست

کے گھر ٹھہرے، دو مہینے تک یہاں قیام رہا، صاحبِ خانہ نیک دل اور نیک طینت تھا

اور چند لوگ بھی شیخ کے طرفدار پیدا ہوگئے، دربارِ شاہی میں تقریب ہوئی، ۹۷۴ھ ۱۲ جلوس

میں اکبر نے بڑے احترام سے بلایا، ابوالفضل کی طبیعت میں اس وقت تک نہایت آزادی

اور بے پروائی تھی، اس نے دربار میں جانے سے انکار کیا، فیضی گئے اور شاہانہ نوازش سے بہرہ یاب آئے،[1] آئین اکبری میں اس موقع پر پہونچ کر ابوالفضل پر شادیِ مرگ کی کیفیت طاری ہوتی ہے، اور بے اختیار یہ رباعی اس کی زبان سے نکلتی ہے،

ای شب نہ کنی آں ہمہ پر خاش کہ دوش	رازِ دلِ من چناں مکن فاش کہ دوش
دیدی چہ دراز بود دوشینہ شبم	ہاں اے شبِ وصل آں چناں باش کہ دوش

فیضی جس شان سے دربار میں پہنچا ہے شہنشاہ نے جس طرح اس کی قدر افزائی کی ہے، حاسدوں نے جس نگاہِ رشک سے اس کو دیکھا ہے، دربار کی جو خدمتیں اس کو سپرد ہوئی ہیں، ان سب حالات کو فیضی نے ایک قصیدہ میں لکھا ہے، ہم اس کے جستہ جستہ اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں،

سحر نوید رساں قاصد سلیمانی	رسید ہمچو سعادت کشادہ پیشانی
بلشترانِ سعادت ندا کناں کہ بجواں	نجات نامۂ خود اے حزینِ زندانی
مرا نظارہ اش از دورِ بیقراری داد	چہ بیقراری با صد قرار ارزانی
بہ بوسہ کردم پایش نگار از آں غافل	کہ کار کرد دو وشوار در قدم رانی
شدم سوار سبک گام توسنے چالاک	کہ کردی از سر دانش سپہر جولانی
خبر بہ بارگہ شہریار شد کاینک	رسید بر درِ فردوس مرغ بستانی
خطاب شد کہ تلطف کناں سانندش	بہ آسمانِ سعادت زینۂ ظلمانی

[1] یہ تمام تفصیل آئین اکبری میں ہے، تعجب یہ ہے کہ ابوالفضل نے فیضی کے پہلی مرتبہ دربار میں پہونچنے کے تذکرہ میں ان واقعات کو لکھا ہے، لیکن اس قدر اختصار کیا ہے کہ واقعہ کی صورت بدل گئی ہے، اور بعض بعض باتیں دونوں بیان مختلف اور متناقض معلوم ہوتے ہیں،

نخست بوسہ دم خاکِ آستاں یعنی | بہ چشمہ سار رساندم شفاہ عطشانی
اشارہ رفت کہ در پیش گاہ مجلسِ انس | شگفتہ دل بنشینی و شوق بنشانی
بپیش پایہ اورنگ بنشستم | زبانِ ناطقہ لب ریزہ در ثنا خوانی
بگونہ گونہ تفقد شہنشہم بنواخت | کہ پایہ پایہ فرد و آمدم ز حیرانی
حدیثِ من بشہنشاہ بندہ پرور بود | چو باخدائے، کلام کلیم عمرانی (استغفراللہ)
بگفت خیز و علم از قلم بکش کاین وز | مسلم است ترا کشور سخن رانی
زباں بنکتہ بجنباں کہ در بدائعِ نظم | فرزدقی بتو ارزانی ست وحسانی
رسید حکم کہ از نکتہ سنجی شعرا | بہ عرضِ ما برساں آن قدر کہ بتوانی
زباں وری کہ دگر باتو در سخن پیچد | سزد بدستِ ادب گردنش بہ پیچانی
چہ گویم آں کہ زلطفش چہ طرف بر بستم | ز ہر چہ لازمہ جانی است وترخانی (ایک لقب ہے)

یہ تمام داستان (قصیدہ کو چھوڑ کر) ابوالفضل نے آئین اکبری کے خاتمہ میں لکھی ہے لیکن اس تصریح کو دانستہ قلم انداز کر گیا کہ شیخ کے خاندان پر یہ تمام آفتیں کس کی بدولت آئیں؟ اور دربار کے تقرب کا سبب کون ہوا،؟ اس کے علاوہ ابوالفضل کے بیان سے یہ بھی نہیں کھلتا کہ اس قدر مخالفت اور کینہ پروری کے اسباب کیا تھے؟ اس لئے ان ابہامات کی تفصیل ذیل میں کیجاتی ہے،

اکبر کے ابتدائی دور میں دو شخص مذہبی حیثیت سے نہایت جاہ و اقتدار رکھتے تھے مخدوم الملک، اور شیخ عبدالنبی، مخدوم الملک کا نام عبداللہ انصاری ہے، شیر شاہ نے اپنے عہدِ سلطنت میں ان کو صدر الاسلام کا خطاب دیا تھا، سلیم شاہ، ان کو اپنے تخت پر بٹھاتا تھا، ہمایوں نے شیخ الاسلام کا خطاب دیا تھا، بیرم خاں نے   روپیہ سالانہ

تنخواہ مقرر کی تھی۔[1]

شیخ عبدالنبی جو شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے نواسے تھے، صدارت پر ممتاز تھے، یعنی جس قدر مذہبی اوقاف اور جاگیریں تھیں، سب کا انتظام ان کے ہاتھ میں تھا، اُنھوں نے اکبر کو اس قدر گرویدہ کیا تھا کہ اکبر ان کے گھر جا کر ان سے حدیث پڑھتا تھا، ان کے فیضِ صحبت سے اکبر کی مذہبی خود رفتگی کی یہ نوبت پہونچی کہ اپنے ہاتھ سے مسجد میں جھاڑو دیتا تھا،

ایک دفعہ سالگرہ کی تقریب میں اکبر نے کپڑوں پر زعفران کا رنگ چھڑکا، شیخ عبدالنبی نے دیکھا تو اس قدر برہم ہوئے کہ لکڑی اٹھا کر ماری، اکبر کو ناگوار ہوا محل میں جا کر مریم مکانی (اکبر کی والدہ) سے شکایت کی کہ بھرے دربار میں ذلیل کرنا مناسب نہ تھا، مریم مکانی نے کہا کہ بیٹا دل پر میل نہ لانا، یہ نجات اخروی کا سبب ہے، قیامت تک چرچا رہے گا کہ ایک مفلوک الحال نے بادشاہ کے ساتھ یہ برتاؤ کیا اور اس نے برداشت کیا[2]

یہ دونوں بزرگ جس قدر دیندار تھے، اسی قدر جاہلانہ تعصب رکھتے تھے، جیسا کہ عام طور پر دینداری کا مقتضا سمجھا جاتا ہے، ان لوگوں نے اکبر کو آمادہ کیا کہ ملک میں جو بدعقیدہ لوگ ہیں، ان کا استیصال کر دیا جائے، چنانچہ عام دار و گیر شروع ہوئی، اور بہت سے لوگ قتل اور قید کئے گئے، مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی نے اکبر سے کہا کہ شیخ مبارک بھی بدعتی ہے، اس کو سزا ملنی چاہئے، چنانچہ اسی وقت محتسب متعین ہوئے کہ شیخ کو پکڑ لائیں، شیخ گھر میں نہ تھا، اس کی مسجد کا منبر توڑ کر چلے آئے[3]

---

[1] مآثر الامراء تذکرۂ مخدوم الملک، [2] مآثر الامراء جلد دوم، صفحہ ۵۶۰، حالات شیخ عبدالنبی، صدر الاسلام، [3] بدایونی صفحہ ۱۹۸،

ایک دفعہ ایک مجلس میں شیخ عبد النبی، یا مخدوم الملک (ابو الفضل نے آئین اکبری میں صاف نام نہیں لیا، بلکہ لکھا ہے کہ سر آمد فتنہ جویاں) سے اس قسم کی سختیوں کے متعلق ابو الفضل سے بحث ہو گئی، ابو الفضل نے دلائل سے اُن کو بند کر دیا،

اسی زمانہ میں یا اس سے کچھ پہلے فیضی شیخ مبارک کو ساتھ لیکر شیخ عبد النبی کے پاس گیا اور اپنی شکستہ حالی کا اظہار کر کے کچھ مدد معاش کی درخواست کی، شیخ نے شیعیت کا الزام لگا کر نہایت ذلت کے ساتھ نکلوا دیا،[۱]

اب یہ دونوں بزرگ اس خاندان کے استیصال پر آمادہ ہوئے، علماء سے فتویٰ لیکر جاسوس متعین کیے کہ شیخ کو ڈھونڈھ لائیں، تمام ملک میں مشہور کرا دیا کہ شیخ کے خاندان کے لئے دربار سے قتل کا حکم ہو چکا ہے، شیخ نے پہلے شیخ سلیم چشتی کی خدمت میں التجا کی کہ میری جان بچائیے، شیخ سلیم نے کچھ زادراہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ سردست مصلحت یہی ہو کہ کہیں نکل جائیے، یہاں سے ناامیدی ہوئی تو میرزا عزیز کے پاس گیا[۲]، مرزا عزیز کی ماں کا دودھ اکبر نے پیا تھا، اس لئے وہ اکبر کی خدمت میں نہایت گستاخ تھا، ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں جو لکھا ہے کہ ایک امیر نے اکبر کے سامنے نہایت گستاخانہ سفارش کی، اس سے مرزا عزیز ہی مراد ہے، مرزا عزیز نے بارہا اکبر کو سر دربار سخت سست کہا اور اکبر یہ کہہ کر چپ ہو جاتا تھا کہ کیا کروں میرے اور عزیز مرزا کے بیچ میں دودھ کا دریا حائل ہے، (دودھ بھائی ہونے کا یہ پاس ہوتا تھا) مرزا عزیز ہی کے توسل سے فیضی کے خاندان کو دربار میں رسائی ہوئی،

اکبر مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی کی تنگ خیالیوں سے تنگ آچکا تھا، اور ان

---

[۱] مآثر الامرا، جلد دوم صفحہ ۵۷۵ و ۵۷۷، [۲] بدایونی صفحہ ۱۹۹،

لوگوں کے زور کو گھٹانا چاہتا تھا لیکن خود جاہل تھا، اس لئے مذہبی فتووں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا فیضی اور ابوالفضل دربار میں پہنچے تو اکبر کو گویا وزارہ ہاتھ آگئے، ان لوگوں نے ہر موقع پر ان متعصبوں کو شکستیں دیں، اور ان کا سارا بھرم کھل گیا، چنانچہ تفصیل اسکی آگے آئے گی،

فیضی کا تقرب روز بروز بڑھتا گیا لیکن اس نے دربار کی کوئی خدمت اختیار نہیں کی، طبیب تھا مصنف تھا، شاعر تھا، اور انہی مشغلوں میں بسر کرتا تھا، شہزادوں کی تعلیم و تربیت کا کام بھی اس سے متعلق تھا، چنانچہ ۲۴ سنہ جلوس میں شہزادۂ دانیال کی تعلیم و تربیت سپرد ہوئی، اور تھوڑے ہی دنوں میں فیضی نے اس کو ضروری مراتب سکھادئیے، جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے کہ شہزادۂ دانیال ہندی (برج بھاکا) کی شاعری سے واقف تھا، اور خود بھی کہتا تھا، یہ فیضی ہی کی صحبت کا اثر ہوگا، اسی سنہ میں اکبر نے اجتہاد و امامت کے دعوے سے مسجد میں جاکر خطبہ پڑھا، یہ خطبہ فیضی نے لکھا تھا، چنانچہ تفصیل اس کی آگے آئے گی،

۲۵ سنہ جلوس میں اکبر نے اظہار عقیدت کے لیے شہزادہ دانیال کو اجمیر کی زیارت کے لیے بھیجا تو فیضی کو بھی اس کے ساتھ متعین کیا،

اکبر نے شیخ عبدالنبی کا زور توڑ کر صدارت کے ٹکڑے کر دیئے تھے، چنانچہ ۹۰۹ سنہ میں آگرہ، کالنجر اور کالپی کی صدارت فیضی کو دی گئی، ۹۹۳ سنہ میں جب یوسف زئی پٹھانوں پر اکبر نے فوجیں بھیجیں تو فیضی بھی اس مہم پر مامور کیا گیا،

۹۹۶ سنہ میں جو اکبر کی تخت نشینی کا تینتیسواں سال تھا، فیضی کو ملک الشعرا

---

[۱] اکبر نامہ نولکشوری، صفحہ ۲۲۵ جلد سوم،

کا خطاب ملا، عجیب اتفاق یہ کہ اس سے دو ہی تین دن پہلے فیضی نے ایک قصیدہ لکھا تھا،

آں روز کہ فیض عام کردند | مارا ملک الکلام کردند
از بہر صعود فکرت من | آرایش ہفت بام کردند
مارا بہ تمام در ربودند | تا کار سخن تمام کردند

۹۹۷ھ میں اکبر نے کشمیر کا سفر کیا تو فیضی بھی ساتھ تھا، قصیدۂ کشمیریہ اسی سفر میں لکھا ہے، جس کا مطلع یہ ہے،

ہزار قافلۂ شوق می کند شبگیر | کہ بار عیش کشاید بہ خطۂ کشمیر

دکن کی حکومتوں کو جب اکبر نے فتح کرنا چاہا، تو ۳۶ جلوس مطابق ۹۹۹ھ ہجری میں پہلے ایک ایک کے پاس سفارتیں بھیجیں، خاندیس کی سلطنت کا فرماں روا راجہ علی خاں تھا، فیضی کو اس کی سفارت پر متعین کیا، فیضی کو اگرچہ یہ خدمت ناگوار تھی، لیکن قبول کرنے کے سوا چارہ نہ تھا، اُس نے سفارت کے معاملات اس خوبی سے انجام دیئے کہ راجہ علیخاں نے حلقہ بگوش بن کر آنے کی اطلاع دی، فیضی نے برہان پور میں دربار آراستہ کیا، تخت پر شاہی تلوار، خلعت اور فرمان شاہی رکھا گیا، راجہ علی خاں دور سے پیادہ ہوا، تخت کے قریب آکر جوتیاں اتاریں، کھڑے ہو کر تین تسلیمیں بجالایا، فیضی نے فرمان شاہی دونوں ہاتھوں میں ادب سے لیکر کہا کہ حضور نے تمھارے نام فرمان بھیجا ہے، راجہ علی خاں نے فرمان دونوں ہاتھوں سے تھام کر سر پر رکھا اور تین تسلیمیں بجا لایا، اسی طرح خلعت اور تلوار عطا کئے جانے پر تسلیمیں کیں، چنانچہ فیضی نے اپنی عرضداشت میں یہ تمام امور تفصیل سے بیان کئے ہیں، یہاں کی مہم سے فارغ ہو کر احمد نگر میں برہان نظام شاہ سے ملا، اور سفارت کے مراتب انجام دیئے،

اس سفر میں اصلی خدمت اگرچہ سفارت کا انجام دینا تھا، لیکن فیضی نے ملک کی ایک ایک چیز پر مبصرانہ نظر ڈالی، اور بادشاہ کو عرضداشت میں مفصل رپوٹ بھیجی، مثلاً راستوں کا کیا انتظام ہے، عہدہ دار اپنی خدمتوں کو کیونکر انجام دیتے ہیں، شہروں میں رفاہ عام کی کیا کیا عمارتیں ہیں، قلعوں کی کیا حالت ہے، زمین کیسی ہے، پیداوار کیا کیا ہے، پھل کیا کیا پیدا ہوتے ہیں، صنعت کے کارخانے کہاں کہاں ہیں، چنانچہ اس رپوٹ کے جستہ جستہ فقرے ہم درج کرتے ہیں،

"بلوچی کہ بہ فوجداری مقرر شدہ نزدیک بہ تنگی کوہ در میانِ لدھیانہ و سرہند چسپیدہ است، دزدانے کہ از کوہ فرود می آید، بہ او ہم حق نذری می دہند، یعقوب بدخشی خدمت فوجداری و علمداری تھانیسر و پرگنات ہر دو بواجبی می تواند کرد۔"

چوں بہ دھولپور رسید، سرائے دیہ از سنگ بغایت رفیع کہ صادق خاں ساختہ، و متصل آں حمام گرمے می باشد، و باغے دلکشا مشتمل بر عمارت دلکش، پسر رشید آں جا بود، سیر قلعۂ گوالیار نیز کردہ شد۔"

و سجاول پور خواجہ امین خویش و وزیر خاں بہ رعایا سلوک خوب کردہ و تقاوی دادہ و پرگنہ معمور ساختہ، کارخانہائے پارچہ بافی ترتیب دادہ کہ چیرہ و فوطہ (یعنی لنگی) برائے حضرت می بافتند، برہان پور و حوالی او اندک جائے است، بغایت تنگ اکثرے بوستان، ہر جا قطعہ زمینے بودہ، مزروع شدہ، از میوہ انجیر خوب می شود خربزہ فرنگی بشاخ درخت بست، بست و سی، سی خوشہ جنباں ست، خربزہ ہندوستانی

ہم ہفتہ باشد کہ رسیدہ "

یہ تو خاص ہندوستان کے حالات تھے، غیر ملکوں کے بھی ہر قسم کے مفید اور ضروری اور قابلِ اعتنا حالات بہم پہنچائے اور عرضداشتوں میں اکبر کو لکھے، مثلاً ایک عرضداشت میں لکھتا ہے،

اب کی چھ جہاز ہرمز سے چلے، خواجہ صفائے عمدۃ التجار، عراقی گھوڑے لے کر آرہا تھا، فرنگیوں کا قاعدہ ہے، کہ گھوڑے چھین لے جاتے ہیں، اور جو پسند آتا ہے رکھ لیتے ہیں، تین جہاز بندرگاہ چول میں سلامت آئے حسن قلی افشار اور حسین بیگ لشکر نویس جو صفویہ سلطنت کے عہدہ دار ہیں آستان بوسی کے ارادہ سے آتے ہیں یہ لوگ اپنے حرم کو بھی ساتھ لاتے ہیں، شاہ عباس صفوی کا سن بیس برس کا ہو، تفنگ اندازی اور چوگان بازی وغیرہ کا شیفتہ ہے، پارسال دو مرتبہ گھوڑے سے گرا، شجاعت اور بہادری اس کے حالات سے ظاہر ہے، ابھی تک کاروبار خود اپنے ہاتھ میں نہیں لئے، فرہاد خاں وکیل اور حاتم بیگ وزیر اعظم تمام کاموں کو انجام دیتے ہیں، پارسال عباس نے خراسان پر لشکر کشی کرنی چاہی تھی، ہرات پہونچ کر فوج میں طاعون پھیلا، اس لئے واپس گیا؛

اسی طرح ایران و روم کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں، اور جن باتوں کو پالٹکس سے تعلق ہے، ان کے ساتھ خاص اعتنا کرتا ہے، ان خطوط کے پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس قدر ملکی معاملات کی تہ تک پہونچتا تھا،

اس عرضداشت میں ملک قمی اور ظہوری کی بھی تقریب اور نہایت تعریف کی ہے اور ان کے عمدہ اشعار نقل کئے ہیں، ان کے علاوہ اور ہر فن کے ارباب کمال کا ذکر کیا ہے بیچ بیچ میں دلچسپ اور لطیف حکایتیں بھی لکھتا جاتا ہے،

غرض ایک برس آٹھ مہینے چودہ دن ان اطراف مین رہا، اور سفارت کا کام نہایت خوبی سے انجام دے کر ۱۰۰۱ھ مین پائے تخت مین آیا،

یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ فیضی کو ملکی معاملات مین کبھی سروکار نہین پڑا تھا، وہ شاعر اور حکیم تھا، اور یہی اُس کا اصلی مذاق تھا، لیکن اُس زمانے مین تعلیم کے طریقے کی یہ خوبی تھی کہ ایک عالم کو جس قسم کی خدمت دیدیجائے اس کو انجام دے سکتا تھا، آج کل کا سا حال نہ تھا کہ مولوی اور عالم، مردہ شوئی اور جنازہ خوانی کے سوا، اور کسی کام نہین آسکتے،

سنہ ۱۰۰۳ھ جلوس مین اکبر نے اصرار کے ساتھ خواہش کی نظامی کے خمسہ کا جواب لکھا جائے، اور نل دمن سے آغاز کیا جائے، چنانچہ فیضی نے نل دمن چار مہینے مین پوری کر کے پیش کی تفصیل اس کی آگے آئے گی،

اسی زمانے مین فیضی کو دمہ کا عارضہ ہوا، اور بیماری کے آغاز مین یہ رباعی کہی[1]،

دیدی کہ فلک چہ زہرہ بیرنگی کرد | مرغ دلم از قفس سبک آہنگی کرد
آن سینہ کہ عالمے درو می گنجید | تا نیم نفس بر آورم تنگی کرد

یہ شعر اکثر زبان پر رہتا تھا،

گر ہمہ عالم بہم آیند تنگ | پہ نہ شود پائے یکے مور لنگ

حکیم مصری اس زمانے کا نہایت مشہور معالج تھا، اس نے بڑی مستعدی سے علاج کیا، لیکن موت کا کیا علاج تھا، مرنے سے دو دن پہلے غفلت طاری رہتی تھی، اکبر کو خبر ہوئی اسی وقت پہنچا، فیضی نے آنکھین کھولین اور آداب بجالایا، اکبر نے خدا کو سونپا

---

[1] مآثر الامرار،

[2] بدایونی حالات حکیم مصری،

اور اٹھ کر چلا آیا[1] ابوالفضل نے تیمارداری کے لئے بادشاہ سے چار دن کی رخصت لی عین نزع کے وقت آدھی رات کو اکبر کو خبر ہوئی بے قراری کی حالت میں آیا، اور فیضی کا سر ہاتھ میں لیکر دو تین دفعہ پکار کر کہا شیخ جیو! (اکبر اسی لقب سے فیضی کو خطاب کیا کرتا تھا) میں حکیم علی کو علاج کیلئے لایا ہوں، آپ بولتے کیوں نہیں؟ شیخ نے جب کچھ جواب نہ دیا تو سر سے پگڑی اتار کر پھینک دی اور ابوالفضل کو تسلی دیکر چلا آیا[2]، صفر ۱۰۰۴ھ میں انتقال کیا،

عام حالات اور اخلاق و عادات

فیضی پر اگرچہ بظاہر شاعری کا احسان ہے کہ آج اس کو جو شہرت ہے اسی نام سے ہے لیکن حقیقت میں شاعری ہی نے اس کے تمام کمالات کو مٹا دیا، ملا عبدالقادر بدایونی سے بڑھ کر اس کا دشمن کون ہوگا تاہم اس کا تذکرہ ان لفظوں سے شروع کرتے ہیں :-

"در فنون جزئیہ از شعر و معما و عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و طب و انشا عدیل در روزگار نہ داشت"

علوم متداولہ میں سے اس کو فقہ، مناظرہ، سیاق اور تاریخ و محاضرات سے رغبت تھی، چنانچہ ایک قطعہ میں خود لکھتا ہے:-

ایا حریف درین بزمگاہ فیضی را	گمان مبر کہ زخیل تہی سبویان ست
بجوہ دشت معانی کہ مرغ پر نزند	بہ چابکی تعقل دو اسپہ پویان ست
گر مسائل فقہ مقلدان ہوا	کہ علم حیلہ گران و بہانہ جویان ست
مشاجرات فرائض کہ کس مخوانادش	از و مپرس کہ او علم مردہ شویان ست
در خلاف و جدل ہم بخویشتن نگشود	کہ آن مقدمہ جنگ تند خویان ست

[1] اکبر نامہ [2] بدایونی،

سیاہ نامۂ اہلِ سباق ہم بنوشت | کہ کار تیرہ درونان سخت پیدا نیست
ندار حرف بتاریخ ہم مدار کہ آن | فسانہائے ملال دروغ گویانست

ایشیائی درباروں میں خوشامد اور تملق کے بغیر کوئی شخص فروغ نہیں پا سکتا لیکن فیضی نے علم کی آبرو قائم رکھی، اُس نے یہ گوارا کیا کہ باوجود اس قدر تقرب اور ہمنشینی کے اس کا منصب چارصدی سے نہ بڑھا، حالانکہ ابوالفضل اس کا چھوٹا بھائی دو نیم ہزاری تھا، لیکن اوروں کی طرح اُس نے عزتِ نفس کو برباد نہیں کیا، صاحب مآثر الامرا فیضی سے خوش نہیں، تاہم فرماتے ہیں،

"پیش آمد و مصاحبت شیخ در پیشگاہ خلافت بہ عنوان علم و کمال بود زیادہ بر چہار صدی منصب نیافت"

کتب خانہ | شیخ کا اصلی مذاق علم و فن کی خدمت تھی کتابوں کا نہایت شائق تھا، ایک گرانبہا کتب خانہ جمع کیا تھا جس میں ۴۶۰۰ کتابیں تھیں، اور اکثر خود مصنف کے ہاتھ کی یا ان کے زمانے کی لکھی ہوئی تھیں، یہ کتابیں تین قسم کے علوم و فنون پر مشتمل تھیں، طب و نجوم و موسیقی، حکمت و تصوف و ہیئت و ہندسہ، تفسیر و حدیث و فقہ وغیرہ، دوستوں کو اکثر خطوط میں کتابوں کے بہم پہونچانے کی فرمائش کرتا ہے، ایک دوست لکھتا ہے ۔

"از کتب حکمت باقسام آنچہ بہم رسد جہت فقیر بگیرند و بہر بہائے کہ باشد"

اجمیر میں ایک دفعہ کسی نے کہا کہ فلاں صاحب نے میر ہزارہ کے ہاتھ سعید ہروی کا دیوان بھیجا ہے، فوراً ان کے گھر پہنچا، اور کتاب کا تقاضا کیا، امیر خسرو کے تغلق نامہ کا ایک نسخہ ہاتھ آیا لیکن اول و آخر سے ناقص تھا، ایک دوست کو لکھتا ہے .

۱؎ کتب خانہ کے متعلق تفصیل بدایونی نے فیضی کے تذکرہ میں لکھی ہے،

"بہ یکے از خدمتگاران امر فرمایند کہ بہر خطے مسودہ نمودہ بجہت بندہ مصحوب

حاملان عریضہ فرستند"

فیاضی | نہایت فیاض اور سخی تھا، اہلِ کمال کے لئے اس کا گھر مہمان سرائے عام تھا، عرفی ایران سے آیا تو اول اسی کا مہمان ہوا اور بہت دنوں تک اس کے گھر پر مقیم رہا، اس کی تفسیر کی تاریخ حیدر معمائی نے سورہ قل ہو اللہ سے نکالی تو دس ہزار روپیے صلہ میں دیے[1]،

درویش پرستی | فقراء اور اہلِ دل کا نہایت گرویدہ تھا، اور اکثر بزرگوں کے مزار پر حاضر ہوتا تھا خواجہ فریدالدین شکر گنج کی خدمت میں خاص ارادت تھی، ان کے مزار پر جب گیا ہے تو کئی قطعے لکھے ہیں، ایک یہ ہے،

سفر گزیدہ تریں نعمتے ست در عالم	زبہر ذوقِ خدادانی و خدا بینی
دریں سفر زپے طوفِ اولیائے عظام	کہ بودہ اند شہاں در لباسِ مسکینی
رسید بہرِ طوافِ مزارِ گنجِ شکر	کہ کردہ زیرِ سرش نہ سپہر بالینی
بلے چو خوانِ کرم اہلِ نعمت آرایند	بروے مائدہ آخر کشند شیرینی

ایک اور قطعہ ہے،

قطبِ ربانی فریدالدین شکر گنج آنکہ خلق	در مقامِ او بہ صد رنج سفر پے بردہ اند

دو تین شعر کے بعد کہتا ہے:-

طوطیان دیدیم در پرواز گردِ مرقدش	گوئی اینہا ہم بآں گنجِ شکر پے بردہ اند

ایک دوست کو لکھتا ہے،

---

[1] ماثر الامرا ذکر فیضی،

"دراحوال ذکر مشایخ ہند، انچہ داشتہ باشند، از ملفوظات وغیرہ ہمہ ہمراہ آرند
البتہ بدست عزیزے کتابے دراحوال مشایخ ہند بود موسوم بہ تذکرۃ الاصفیاء اگر دراں
شہر بہم رسد، بہم رسانند کہ بسیار مطلوب ست"

رشک وحسد اور ناتواں بینی شعراء کا عام خاصہ ہے لیکن فیضی تمام معاصرین کا نام
نہایت عزت اور محبت سے لیتا ہے، اور دربار شاہی میں ان کی سفارش کرتا ہے، اکبر کو
ایک عرضداشت میں لکھتا ہے :۔

"در احمد نگر دو شاعر خاکی نہاد صافی مشرب اند و در شعر رتبۂ عالی دارند، یکے
ملک قمی کہ بہ کس کمتر اختلاط می کند، و ہمیشہ مزہ ترے دارد، دیگر ملا ظہوری کہ
بغایت رنگیں کلام ست، و در مکارم اخلاق تمام عزیمت آستاں بوس دارد"
دونوں کے اشعار بھی نقل کئے ہیں،

ملک قمی کا دیوان اول اول فیضی ہی دکن سے اپنے ساتھ لایا[1]، غزالی شاعر مرا تو
اُس کی تاریخ کہی،

قدوۂ نظم غزالی کہ سخن	ہمہ از طبع خداداد نوشت
عقل تاریخ وفاتش بدو طور	سنہ نہ صد و ہشتاد نوشت

عرفی کی نسبت عام طور پر یہ مشہور ہے کہ فیضی اس سے جلتا تھا، اور دونوں میں ہمیشہ
نوک جھوک رہتی تھی، چنانچہ اس قسم کے قصے، خافی خاں اور بدایونی نے بھی نقل کئے ہیں،
لیکن فیضی کے مکاتیب موجود ہیں، اس میں ایک دوست کو خط لکھا ہے، اور عرفی کی اس قدر
تعریف کی ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی، ہم اُس کے خاص الفاظ عرفی کے حال میں

---

[1] بدایونی تذکرۂ ملک قمی،

نقل کریں گے،

نہایت حلیم اور نیک نفس تھا، ملا عبد القادر بدایونی کا برتاؤ جو اس کے ساتھ تھا،
ان کا اندازہ اُن الفاظ سے ہو سکتا ہے جو ملا صاحب نے اس کی نسبت استعمال کئے ہیں،
چنانچہ اس کے حالات میں لکھتے ہیں:-

"مخترع جدل و ہزل و عجب و کبر و حقد و مجموعۂ نفاق و خباثت و ریا و حب جاہ،
و خیلاء و رعونت بود، در وادی عناد و عداوت با اہل اسلام و طعن در اصل اصول
دین و اہانت مذہب و مذمت صحابۂ کرام و تابعین و سلف و خلف متقدمین و متاخرین
و مشائخ و اموات و احیاء و بی ادبی و بے تحاشی نسبت بہمہ علماء و صلحاء و فضلا
سراً و جہاراً لیلاً و نہاراً ہمہ یہود و نصاریٰ و ہنود و مجوس برو ہزار شرف داشتند"

لیکن فیضی کا سلوک ملا صاحب کے ساتھ یہ تھا کہ ملا صاحب جب دربار اکبری سے
معتوب ہوئے، تو سنہ ۱۰۰۱ ہجری میں اُس نے احمد نگر سے ایک خط اکبر کو لکھا جس میں ملا صاحب
کے کمالات کی بے انتہا تعریف کی، ان کے علمی اور اخلاقی کمالات آٹھ دس سطر میں گنائے
ہیں، آخر میں لکھا ہے کہ گویا میں خود حضور کی درگاہ میں حاضر ہو کر نامبردہ کے اوصاف عرض
کر رہا ہوں، اور نہ کرتا تو حق پوشی کا مجرم ہوتا، ملا صاحب کی غیرت کی داد دینی چاہئے،
کہ خود اس کو اپنی کتاب میں نقل بھی کیا ہے، اور چونکہ یہ کھٹکا بھی تھا کہ لوگ کیا کہیں گے
اس لئے فرماتے ہیں:-

"اما چہ تواں کرد کہ حق دین و حفظ عہد آں بالاتر از ہمہ حقوق ست
الحب للہ والبغض للہ،"

ملا صاحب اور اُن کے تمام پیرووں نے متفقاً فیضی کو ملحد، بے دین، زندیق اور

کافر لکھا ہے، ملا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ فیضی مرنے کے وقت کتوں کی طرح بھونکتا تھا، اور اس کے ہونٹھ سیاہ ہو گئے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ فیضی کے رتبہ کو سمجھ نہیں سکتے تھے، وہ جو حکیمانہ خیالات ظاہر کرتا تھا، ان لوگوں کو الحاد اور زندقہ نظر آتا تھا فیضی کے مذہب اور اُس کے خیالات سے اس کا دیوان بھرا پڑا ہے، اس کے پاکیزہ خیالات خود اُس کی زبان سے سنو،

ما طائر قدسیم نوا را نشناسیم　　مرغ ملکوتیم ہوا را نشناسیم
برہان ثبوتیم ز ما نفی نیاید　　از ما نغم آموز کہ لا را نشناسیم
در کشف حقائق سبق آموز ضمیرا　　ترتیب دلیل حکما را نشناسیم
با اہل جدل نکتہ توحید نہ گوئیم　　در وحدت حق چون و چرا را نشناسیم
اصحاب یقینیم، گمان را نہ پسندیم　　ارباب صوابیم خطا را نشناسیم
از قافلہ ما نتوان یافت نشانے　　رقص جرس و بانگ درا را نشناسیم
نور جبر دتیم، ز ظلمت نہ ہراسیم　　آئینہ صبحیم، مسا را نشناسیم
بر دانش ما انجم و افلاک بخندند　　گر صاحب لولاک لما را نشناسیم
صد شکر کہ ما پیرو اصحاب سویم　　در شرع، دگر راہ نما را نشناسیم

اس کے بعد چاروں خلفا کے اوصاف بیان کئے ہیں،

بدایونی وغیرہ کہتے ہیں کہ فیضی فلسفہ کو شرع پر مقدم سمجھتا تھا، لیکن وہ خود مرکز ادوار میں لکھتا ہے:۔

معنی قرآن چہ ادا می کنی　　ایں ہمہ تاویل چرا می کنی
حق ز تو با غیر مشابہ شدہ　　پیش تو محکم متشابہ شدہ

فہم تو از قولِ نبی اجنبی | بے خبر از سرِّ حدیثِ نبی
چوں سخن از شرح حج می رود | فکرِ تو چوں حاشیہ کج می رود
طعنہ مزن ایں ہمہ بر اختلاف | کز پے تسہیلِ تو رفت اختلاف
گر ہمیاں ور بہ طرف رفتہ اند | راہ چناں رو کہ سلف رفتہ اند
بہر ریاضی بہ ریاضت مکوش | نورِ الٰہی بہ طبیعی مپوش
از خطِ اقلیدس دستخطش مگوی | تختۂ اشکالِ مجسطی بشوی
بگذر ازیں علم و عمل پیش گیر | ترک قوانین جدل پیش گیر

با ایں ہمہ وہ فراخ مشرب اور آزاد خیال تھا، اور جانتا تھا کہ متعصب مولویوں نے مذہب کی جو صورت بنا رکھی ہے، یہ اسلام کی اصلی تصویر نہیں، شیعہ سنی کے جھگڑوں کو وہ اصل مذہب سے غیر متعلق سمجھتا تھا، اور ان خانہ جنگیوں کی ہنسی اڑاتا تھا اکبر کی ایک عرضداشت میں لکھتا ہے، کہ ایک اوذبک ترک ہاتھ میں دھاگا لئے پھرتا تھا، لوگوں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ بولا کہ میری ماں نے دیا ہے کہ کسی رافضی کے خون سے رنگین کر لا، تو میں رکھ چھوڑوں کہ میرے کفن کے سینے میں کام آئے۔ اسی عرضداشت میں لکھتا ہے، کہ چند احباب ایک حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، ایک شخص نے کہا کہ اسی طرح حوضِ کوثر کے چاروں کونے پر خلفاے اربعہ رض تشریف رکھتے ہوں گے، اور مومنین کو آب کوثر پلاتے ہوں گے، ایک شیعہ جس کا نام محمود صباغ تھا، بولا کہ کیا فضول بکتے ہو، حوض کوثر مدور ہے، اور اس کے ساقی مرتضیٰ علی رض ہیں، یہ کہہ کر بھاگا، یہ حکایتیں لکھ کر فیضی حضرت خواجہ فرید الدین عطار کے یہ اشعار نقل کرتا ہے،

ز نادانی دلِ پر جہل و پُر مکر | گرفتار علی ماندی و بوبکر

چو یک دم زیں تخیل می نرستی | نمی دانم خدا را کے پرستی

فیضی پر بڑا الزام یہ ہے کہ اُس نے اکبر کو لامذہب اور ملحد بنا دیا، اس جھوٹ میں صرف اس قدر سچ ہے کہ ایک زمانے میں شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک نے اس قدر تعصب پھیلا دیا تھا کہ غیر مذہب کے لوگ علانیہ قتل اور گرفتار کئے جاتے تھے، خود بدایونی کی کتاب میں متعدد واقعات ہیں کہ بہت سے لوگ بدعتی اور رافضی ہونے کے جرم میں قتل کر دیئے گئے، فیضی اور ابوالفضل نے اکبر کی اس تنگ خیالی کی اصلاح کی، لیکن عبدالنبی اور مخدوم الملک کا اثر ملک پر اس قدر غالب آچکا تھا کہ ان کا زور توڑنا مشکل تھا، فیضی اور ابوالفضل نے سمی مجلسیں قائم کرائیں جن میں درباریوں کو علانیہ نظر آیا کہ ان متعصبوں کے پاس لعن اور تکفیر کے سوا کوئی اوزار نہیں، اس کے بعد ۹۸۷ھ جلوس ۲۴ ہجری میں ایک محضرنامہ تیار کرایا، جس کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہ ظل اللہ ہے، اس کو یہ منصب حاصل ہے کہ مسائل مختلفہ میں جس مجتہد کے قول کو چاہے اختیار کرے، اور وہی حجت ہوگا،، اس محضر کی عبارت شیخ مبارک نے لکھی اور فیضی اور ابوالفضل نے اُس پر دستخط کئے، لطف یہ کہ شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو بھی دستخط کرنے پڑے، اکبر نے یہ بھی چاہا کہ اعلانِ عام کی غرض سے جمعہ کی نماز بھی پڑھ لے، تاکہ منصبِ امامت مسلّم ہو جائے، فیضی نے خطبہ لکھدیا،

بنام آں کہ ما را سروری داد | دلے دانا و بازوے قوی داد
بود وصفش ز حدِ فہم برتر | تعالیٰ شانہٗ، اللہ اکبر

ان کارروائیوں نے متعصب مولویوں کا زور توڑ دیا، اور اکبر کو موقع ملا کہ وہ ایک ایسی وسیع اور آزادانہ حکومت قائم کرے، جس کے سایہ میں ہندو، مسلمان

یہود و نصاری سب آزادی کے ساتھ اپنے فرائضِ مذہبی ادا کرسکیں اور یہی طرز حکومت خلفاے راشدینؓ نے قائم کیا تھا،

اس میں شبہ نہیں کہ اکبر اس عالم میں حد سے تجاوز کر گیا تھا، درباریوں نے اس کو بنانا شروع کیا، اور وہ بنتا گیا، وسعت مشرب میں اُس نے آتش پرستی اور آفتاب پرستی تک کی لیکن اس میں فیضی کا کیا قصور ہے فیضی سے جہاں تک ہوسکا اُس نے ہر موقع پر مذہبی پہلو قائم رکھا، یاد ہوگا جب اکبر کے حکم سے ابوالفضل نے توریت کا ترجمہ سنانا شروع کیا اور یہ مصرع پڑھا،

ع   اے نامی ژژد کرسٹو   (جیزس کرائسٹ)

تو فیضی برابر سے بولا

ع   سُبحانک لا سِوَاک یا ہو

فیضی نے تفسیر ان واقعات کے بعد لکھی ہے لیکن ایک ذرہ مسلّمات عام کی شاہراہ سے نہیں ہٹا، حالانکہ تفسیر میں ہر قدم پر اُس کو آزاد خیالی دکھانے کا موقع حاصل تھا، مُلّا صاحب تو فرماتے ہیں کہ وہ تمام عقائد اسلام کا منکر تھا لیکن وہ ان تمام عقائد کا معترف نظر آتا ہے جن کو معتقدات عوام کہتے ہیں معراج کی نسبت اکثر علماے اسلام کا خیال ہے کہ روحانی تھی لیکن فیضی اس پر راضی نہیں، چنانچہ کہتا ہے:-

دور است برو کہ راہ کج نیست	حاجت بہ دلائل و حجج نیست
آں را چہ وقوف ازیں مقام است	کو منکر خرق و التیام ست

سچ تو یہ ہے کہ فیضی کی مذہبی آزادی ہم جو کچھ سنتے ہیں زبانی سنتے ہیں تصنیفات

ہیں تو وہ ملائے مسجدی نظر آتا ہے،

فیضیؔ اگرچہ ریاکار مولویوں کو نہایت برا سمجھتا تھا لیکن اصلی مقدس بزرگوں سے نہایت عقیدت رکھتا تھا، شیخ عبد الحق صاحب محدث دہلوی سے اس کو نہایت خلوص تھا، ایک مدت تک فتح پور میں ملا کر ان کو مہمان رکھا، پھر جب دربار کی مذہبی بدنامی پھیلی تو شیخ دلی چلے گئے، فیضیؔ نے بار بار بلایا لیکن شیخ نے عذر کیا، بآلاخر شیخ نے ایک خط لکھا جس میں ان کو آئندہ تکلیف نہ دینے کا اظہار کیا، لیکن یہ بھی لکھا کہ خط و کتابت سے دریغ نہ کیجئے گا[1] اخیر کے فقرے یہ ہیں:-

"اگر بال و پرے می داشتم، ہر روز بر بام آن حجرہ می نشستم، و دانہ چین نکات محبت می شدم، دیگر چہ نویسم، طلب ہاے در وانہ ازاں جا دیر می رسد از برائے خدا بر من قافلہ اسرار خود در ادراہ نہ بندند"

ملا صاحب، ان تمام باتوں کو فیضیؔ کی ستم ظریفی سمجھتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ وہ گرمیِ محفل کے لیے ان بزرگوں کو اپنے یہاں بلاتا تھا،

اس زمانے میں نشانی صاحب ایک مہر کن ملا صاحب کے ساختہ پرداختہ تھے، وہ فیضیؔ کے عروج کو دیکھ کر سخت جلتے تھے، اور اس کی شان میں ہجو آمیز اشعار کہا کرتے تھے فیضیؔ نے ایک قصیدہ لکھا تھا،

شکر خدا کہ عشقِ بتان ست رہبرم ۔ بر ملتِ برہمن و بر دین آذرم

اگرچہ فیضیؔ نے اس شعر کے بعد بیت اور برہمن کے معنی بتا دیئے تھے کہ متداول معنی مراد نہیں

---

[1] تاریخ بدایونی، تذکرہ شیخ عبد الحق دہلوی،

بت چیست؟ رخ نگاشتۂ معنی مُبیں | کاندر کلیسائے ضمیر ست مضمرم
استاد، برہمن کہ زبت خانۂ خیال | در سجدۂ حضور فرود آورد سہرم

لیکن نشانی صاحب، اس لطف کو کیا سمجھ سکتے تھے، اُنھوں نے اس کی چوٹ پر فوراً ایک قصیدہ لکھ ڈالا،

شکرِ خدا کہ پیرو دینِ پیمبرم | حبِ رسول و آلِ رسول ست رہبرم
قائل بہ روز حشر و قیام قیامتم | امیدوار جنت و حوری و کوثرم

یہانتک بھی غنیمت ہے لیکن ایک مثنوی میں فیضی کے کمالِ شاعری کا بھی انکار کرتے ہیں،

دعویٰ ایجاد معانی مکن | شمع نۂ چرب زبانی مکن
طبع تو ہر چند در ہوش زد | یک سخن تشنہ نشد گوش زد
انچہ تو گفتی دگراں گفتہ اند | در کہ تو سفتی دگراں سفتہ اند
خانہ کہ از نظم بیا راستی | آب و گلش از دگراں خواستی
تازگی آں نہ ز بارانِ تست | از خوی پیشانی یارانِ تست
چند پئے نقد کساں سوختن | چشم بہ مال دگراں دوختن
شربت بیگانہ فراموش کن | آب ز سرچشمۂ خود نوش کن
گر خضری آبِ حیات تو کو؟ | ور شکری شاخ نبات تو کو؟

ملا صاحب نے ان اشعار کو نشانی کے حال میں نہایت جوش سے نقل کیا ہے، خود بھی فیضی کے حال میں فرما چکے ہیں کہ چالیس برس تک استخواں بندی کرتا رہا، لیکن ایک شعر مزہ کا نہ نکلا، لطف یہ کہ ملدمن کے ذکر میں خود لکھ چکے ہیں کہ تین سو

برس سے ایسی مثنوی نہیں لکھی گئی، ملا صاحب کی ان دو رنگیوں پر بے ساختہ یہ شعر یاد آتا ہے،

از ان بہ درد دگر ہر زمان گرفتارم — کہ شیوہ ہائے ترا باہم آشنائی نیست

فیضی کو اپنے خاندان سے نہایت محبت تھی، تفسیر میں کوئی موقع نہ تھا، لیکن اپنے آٹھوں بھائیوں کا ذکر کیا ہے، خطوط میں ابوالفضل کو علامی اخوی نواب اخوی لکھتا ہے، اور اس انداز سے لکھتا ہے، کہ محبت کا نشہ ٹپکتا ہے، قصیدہ فخریہ میں ابوالفضل کی نسبت لکھتا ہے،

دو فضل مفتخر زگرامی برادرم — باایں چنیں پدر کہ نوشتم مکارمش

در عمر اگرچہ یک دو سہ سالے فزونترم — صد سالہ درمیان من و اوست در کمال

۹۹۷ھ ہجری میں اکبر کے ساتھ پشاور میں تھا کہ خبر پہونچی کہ والدہ بیمار ہیں، بادشاہ کا ساتھ چھوڑ کر لاہور پہونچا، یہاں ان کا انتقال ہو چکا تھا، بے تاب ہو گیا، اس عالم میں جو خط لکھے ہیں، اُن سے خون ٹپکتا ہے، ایک دوست کو لکھتا ہے:۔

" بالفعل حالے دارد کہ بندہ را نمی توان شناخت، بدن در کاہش افتادہ و اندوہ کارگر آمدہ ضعف و اسہال روی نمود، و دل از حیات سرد شدہ بخدائے خدا سوگند کہ از ہزار یکے نوشتہ است "

تین برس کا بچہ مر گیا ہے، اُس کے غم میں جانگداز مرثیہ لکھا ہے،

شد وقت آں کہ دیدہ چو دل غرق خوں کنم — خوں نابۂ گرہ شدہ از دل بروں کنم

آں غصۂ کہ بیش نخوردم کنوں خورم — واں نالۂ کہ بیش نہ کردم کنوں کنم

گویند غافلان رہ صبر اختیار کن — چوں اختیار درکف من نیست چوں کنم

اے روشنیِ دیدۂ روشن چگونہ | من بے تو تیرہ روز تو بے من چگونہ
ماتم سراست خانۂ من در فراقِ تو | تو زیر خاک ساختہ مسکن چگونہ
بر خار و خس کہ بستر و بالینِ خوابِ تست | اے یاسمین عذار سمن تن چگونہ

تصنیفات | صاحب مآثر الامرا نے لکھا ہے کہ فیضی نے ایک سو ایک کتابیں تصنیف کیں، ان میں سے جن کتابوں کا پتہ چلتا ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے،

خمسہ یعنی نظامی کی پانچوں مثنویوں کا جواب، ان کی تفصیل خود ایک خط میں کی ہے چنانچہ لکھتے ہیں :-

" اسامی کتب خمسہ این ست. اوّل مرکز ادوار کہ اکثرے در فتح پور گفتہ شدہ بود، دوم سلیمان و بلقیس کہ پیش ازیں ہفت سال در لاہور بنیاد کردہ بود و چیزے چند ازاں گفتہ، سوم نلدمن کہ تمام شد، چہارم ہفت کشور کہ در احوالِ ہفت اقلیم گفتہ خواہد شد، پنجم اکبر نامہ کہ آں ہم جستہ جستہ دفتے گفتہ بود "

ان میں سے دو کتابیں یعنی نلدمن اور مرکز ادوار انجام کو پہنچیں اور آج بھی ملتی ہیں، مرکز ادوار کی ترتیب شیخ ابوالفضل نے فیضی کے مرنے کے بعد کی،

مرکز ادوار کا عمدہ نسخہ ہمارے کتب خانہ میں جو اب ندوہ پر وقف کر دیا گیا موجود ہے،

۳۰ سنہ جلوس میں فیضی کو خمسہ کا خیال پیدا ہوا اور سب سے پہلے مرکز ادوار شروع کی، اس کے ساتھ اور مثنویوں کی بھی بنیاد ڈالی، اور سب کے کچھ کچھ شعر لکھے لیکن چونکہ بہت سے مشغلے پیش آتے رہتے تھے، کوئی کتاب انجام کو نہ پہنچ سکی ۳۹ سنہ جلوس میں اکبر

نے اصرار کے ساتھ کہا کہ خمسہ کو پورا کرنا چاہیے، اور سب سے پہلے نلدمن انجام پائے چونکہ ہندوؤں کا قصہ تھا، اکبر کے میلانِ طبع نے اس کو مقدم رکھا، چنانچہ چار مہینے میں تمام ہوئی، چار ہزار شعر ہیں، چنانچہ خود کہتے ہیں،

ایں چار ہزار گوہر ناب کانگیختہ ام بہ آتشیں آب

فیضی نے یہ مثنوی اکبر کی خدمت میں پیش کی، اور دستور کے موافق اشرفیاں نذر کیں، اکبر نہایت محظوظ ہوا اور حکم دیا کہ خوشخط لکھوا کر جا بجا مرقعے اور تصویریں شامل کی جائیں نقیب خاں کو حکم ہوا کہ وہ پڑھ کر سنایا کرے،

ملا عبد القادر صاحب بدایونی، ہر جگہ جہاں فیضی کا ذکر آتا ہے بے نقط سناتے ہیں لیکن یہاں ان کو بھی مجبور ہو کر تعریف کرنی پڑی، چنانچہ فرماتے ہیں

"واقعی مثنوی ست کہ دریں صد سال مثل آں بعد از امیر خسرو شاید دہند کسے دیگر گفتہ باشد"

ابو الفضل نے اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ سب مثنویاں پوری ہوئیں لیکن کوئی عینی شہادت پیش نہیں کی، بلکہ فیضی کے اشعار سے استدلال کیا ہے[1] لیکن جو شعر استدلال میں نقل کئے ہیں ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا، اشعار یہ ہیں:

زیں ہفت رباط و چار منزل بندم بہ جمازہ پنج محمل

آں چار حروف ہفت خرگاہ کاندر و میانِ نیمہ راہ

چندیں اگرم اماں دہد بخت یک یک برم بپایۂ تخت

گر فشکندم سپہر پیماں بلقیس برم بر سلیمان

[1] یہ پوری تفصیل اکبر نامہ واقعات ۳۹ جلوس میں ہے،

نلدمن اور مرکز ادوار پر یو یو آگے آئیگا سلیمان بلقیس کا یہ انداز ہے،

الٰہی پردۂ تقدیس بگشاے	سلیمانِ مرا بلقیس بنماے
دلِ من با بتانِ آذری چند	سلیمانے گرفتارِ پری چند
چنانم از بلندی در دہ آواز	کہ آید ہُدہُد شوقم بہ پرواز
گرہ شد ہفت دریا در گلویم	گشایش نیست ممکن تا نہ گویم
وگر رفتم کہ بگذارم مقابل	شگافِ خانہ را بار وزن دل

اکبر کی مہم گجرات پر ایک مثنوی لکھی تھی وہ بھی ناپید ہے، چند شعر ایک خط میں نقل گئے ہیں،

ملاحظہ ہوں،

ہماندم اہالی و حکام شہر	کہ در شہر بودند مشہور دہر
ہمہ کردہ آویزۂ دستِ خویش	کلید در گنجِ شاہاں بہ پیش
رسیدند از سر قدم ساختہ	ز شادی سراپاے نشناختہ
سر خود نہادند بر پاے شاہ	کہ ماییم سر تا قدم در گناہ
ز عمرے کہ بگذشتہ در بندگی	بصد گونہ داریم شرمندگی
رسیدیم در خدمت بندہ دار	بجز بندگی بندگان را چہ کار

نہایت بھیس بھیسی اور ہندیانہ ترکیبیں ہیں، اس لیے قلم انداز کرتا ہوں،

موارد الکلم تفسیر غیر منقوط لکھنے کا جب ارادہ کیا، تو مشق کے طور پر پہلے یہ کتاب لکھی

کہ ہاتھ صاف ہو جائے، کلکتہ میں چھپ گئی ہے، فیضی کے ایک رقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ

۹۸۵ ہجری کی تصنیف ہے، فیضی نے اس کو بلادِ عرب میں بھیجا تھا، اور لوگوں نے حسبِ دستور

اس کو بہت کچھ داد دی،

سواطع الالہام یعنی تفسیر غیر منقوط ۱۰۰۲ھ میں تمام ہوئی کل مدت تصنیف دو ڈھائی برس ہے، اس تفسیر پر فیضی کو بڑا ناز ہے، دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں اُن میں اکثر فخر سے اس کا تذکرہ کرتا ہے، جن لوگوں نے تاریخیں اور تقریظیں لکھیں، ان کے نام بھی لکھے ہیں، ایک خط میں لکھتا ہے :-

" در عاشر ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ ہجری اثنین و الف کہ سال حال ست تمام شد، ایں عطیۂ غیبی مخصوص فقیر بود، غرابتش زیادہ ازان ست کہ حیرت افزائے ایں فن نہ گردد "

دیباچہ میں لکھا ہے کہ جب ابتدا کی تو والد کو دکھایا، وہ بہت خوش ہوئے اور بعض فقرے بدل دیئے، چھٹا حصہ تمام ہوا تو اکبر نے فیضی کو دکن کی مہم پر بھیجدیا، اس مہم میں ایک سال سے زیادہ توقف ہوا، اسی اثنا میں شیخ مبارک کا انتقال ہو گیا، پھر تفسیر رُک گئی، اور ایک سال سے کچھ کم رُکی رہی، دوسرے سال کے آغاز میں شروع کی، اور انجام کو پہونچائی، تفسیر خیر جو کچھ ہے، ہے لیکن تاریخیں اور تقریظیں خوب لکھی گئی ہیں، ملا حیدر کاشانی نے پوری قُل ہو اللہ سے تاریخ نکالی یعنی اس سورۃ کے حرفوں کے عدد شمار کئے جائیں تو ۱۰۰۲ ہوتے ہیں، ایک اور شخص نے اس آیت سے تاریخ نکالی لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین ظہوری اور ملک قمی نے قصیدے اور رباعیاں لکھیں، چند رباعیاں درج کرتا ہوں جن میں غیر منقوط ہونے کی توجیہ شاعرانہ طریقہ سے کی ہے،

زانا سے ازیں دفتر کل دریا شد	پیدا است نقاطش زچہ ناپیدا شد
شد زقت حصاد دانہا خرمن گشت	شد سیر تمام، قطرہ ہا دریا شد
از چین سخن گراں سخن نتواں ساخت	بوے بوزید صفحہ نشک فشاں ساخت

صیّادِ خیال از پے آہوے قلم ہر نافہ کہ چید در بغل پنہاں ساخت

ایں نسخہ کہ شاد کرد ناشاداں را رو ساختہ شاگردیِ استاداں را
بر نقطہ زنتار خط بیفگند کمند در بند رو انداشت آزاداں را

اے بخت بیا یاریِ ایں بیکس کن تا پیش روم موانعِ رہ بس کن
ہر نقطہ کہ کردند ازیں نسخہ بروں شد مہر لبِ سخن ظہوری بس کن

ایں خردہ چہ خردہا کہ نایاب شدند ذرّات دریں شعشعہ سیماب شدند
از پردۂ نقطہ حسن معنی بدمید خورشید برآمد، اختراں آب شدند

فیضِ ازل از چہرہ برافگند نقاب از لوحِ خرد، سترد آثار حجاب
سر زد خورشید معنی از مشرقِ نقط نیلوفر نقطہ سر فرو برد بہ آب

سخت تعجب ہے کہ فیضی جیسے حکیم اور فلسفہ پسند شخص نے کیونکر یہ بیہودہ مغز کاوی گوارا کی، تفسیر کو پڑھکر بجز اس کے کہ جابجا مہمل الفاظ جمع کردیئے ہیں اور کچھ اثر طبیعت پر نہیں ہوتا، یہ سچ ہے کہ اور کوئی شخص اس کمان کو زہ نہیں کرسکتا لیکن بہرحال ایک لغو کام ہے، کسی سے بن آئے یا نہ آئے، طرّہ یہ کہ فیضی کے مخالفین نے اس موقع پر بھی اعتراض کیا تو یہ کیا کہ آج تک کسی نے بے نقط تفسیر نہیں لکھی، اس لئے یہ بدعت ہے، اور اس لئے خلافِ شریعت، ہی فیضی نے برجستہ جواب دیا کہ خود کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ سرتاپا غیر منقوط ہے،

انشائے فیضی، نور الدین محمد عبد اللہ بن حکیم عین الملک کہ نسلاً ایرانی اور خود ہندوستان زا تھے فیضی کے بھانجے اور شاگرد تھے، انھوں نے فیضی کے تمام مکاتیب خطوط بہم پہنچا کر کے ایک مجموعہ مرتب کیا، اور لطیفۂ فیضی نام رکھا، اس وقت تک خطوط اور مراسلات سے بیان واقعہ کے بجائے زیادہ تر اظہار انشا پردازی مقصود ہوتا تھا، فیضی پہلا شخص ہے جس نے سادہ نگاری کی ابتدا کی، اس طرز میں اس کا کوئی نظیر ہے تو حکیم ابو الفتح ہے جس کے رقعات چار باغ کے نام سے مشہور ہیں

فیضی کے خطوط سے اس زمانے کے تمدن، تہذیب، معاشرت، آداب، رسوم ہر قسم کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں، بعض بعض جگہ ہندی الفاظ بھی بول جاتا ہے، مثلاً والدہ کو "بوا جیو" کہا کرتا تھا، خط میں ان کا ذکر آگیا ہے تو یہی لفظ لکھدیا ہے،

دیوانِ غزلیات کچھ اوپر نو ہزار شعر ہیں، خود دیباچہ لکھا ہے، اور یہ تعداد بھی اس میں لکھی ہے، دیباچہ میں یہ بھی عذر کیا ہے کہ اس میں پست و بلند ہر قسم کا کلام ہے، خاتمہ میں چند رباعیاں لکھی ہیں، ایک یہ ہے،

ایں قصر سخن یافت عمارت از من	دریافت زاحباب اشارت از من
ہر نکتہ کہ می ریخت ز نوک قلمم	معنی ز خدا بود و عبارت از من

دیوان کا نام طباشیر الصبح رکھا، ایک خط سے جو ایک دوست کو لکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان جب مرتب ہوا ہے، تو فیضی کی عمر ۴۰ سے کچھ اوپر تھی، اسی خط سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ غزل گوئی کا سلسلہ بند نہیں ہوا، بلکہ دوسرے دیوان کی تیاری کی ہے،

قصائد مختصر سا مجموعہ ہے، حمد و نعت، مدح، فخر، تصوف، اخلاق وغیرہ مضامین پر الگ الگ قصیدے لکھے ہیں، قصیدوں کی تعداد کم ہے، قصائد کئی سو شعر کے ہیں، طرز بھی اپنے

معاصروں سے الگ اختیار کی ہیں، بیٹے کا ایک مرثیہ بھی ہے اور نہایت پُردرد ہے خاتمہ

میں قطعات بھی ہیں لیکن یہ قطعات دیوان میں بھی شامل ہیں بعض قصائد الحاقی معلوم

ہوتے ہیں مثلاً یہ قصیدہ

وصی نبی آں کہ از صلب فطرت — بہ شاہ اولوالعزم توام نشیند

امامے کہ روز وفات پیمبر — خلافت گذارد بہ ماتم نشیند

گرفتم معاند دریں تنگ میداں — بہ ہو اشہب خرامد بر ادھم نشیند

بکار تبہ کعبہ یابد سفیہے — کہ فردا بہ قعر جہنم نشیند

جہاں پر شد از فتنہ یا شاہ مرداں — تو برخیز کاشوب عالم نشیند

ابوالفضل کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ فیضی کے کل کلام کی تعداد ۵۰ ہزار کے

لگ بھگ ہے،

تذکرہ، شعرا کا تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا لیکن اس کے سوا کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا

کہ ایک خط میں ایک دوست کو لکھتے ہیں :-

"کتاب مقاصد الشعراء را البتہ البتہ چوں تشریف آرند ہمراہ آرند کہ

اختتام تذکرہ موقوف بہ آں ماندہ، و از کتب دیگر ہم انچہ توانند استنباط فرمودہ

فرمایند کہ فقیر می خواہم، در خطبۂ آں ذکر شریف کنم"

مہابھارت، ۹۰۹ھ ہجری میں اکبر نے حکم دیا کہ مہابھارت کا ترجمہ کیا جائے بڑے

بڑے گنوان پنڈت جمع ہوئے، اکبر خود عبارت کا مطلب نقیب خاں کو سمجھاتا جاتا تھا

اور وہ فارسی میں ترجمہ کرتا تھا، پھر عبدالقادر بدایونی، ملا شیری وغیرہ کو الگ الگ کر کے

سپرد کئے، دو فن فیضی کے حصّے میں آئے،

اتھرون بید، اس کا ترجمہ بھی فیضی کی طرف منسوب ہے لیکن عبد القادر بدایونی کی تحریر سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ۹۸۳ھ میں بھاون نام ایک برہمن جو دکن کا رہنے والا تھا، اسلام لایا، اور دربار میں حاضر ہوا، اکبر نے اس کو حکم دیا کہ اتھرون بید کا ترجمہ کرائے، اوّل ان کا کلام ملا عبد القادر بدایونی کے سپرد ہوا یعنی **بھاون** مطلب سمجھاتا جائے اور یہ فارسی میں لکھتے جائیں، لیکن چونکہ اس کی عبارت نہایت پیچیدہ تھی، ملا صاحب نے عذر کیا، اکبر نے ملا صاحب کے بجائے فیضی اور پھر فیضی کے بجائے ابراہیم سرہندی کو ترجمہ کا حکم دیا، فارسی راماین کو بھی عام لوگ فیضی کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن یہ محض غلط ہے راماین کا ترجمہ اصل میں بدایونی نے ۹۹۹ھ ہجری میں چار برس کی محنت میں کیا تھا، پھر مسیحائے پانی پتی نے نظم میں لکھا، جو آج عام طور پر مشہور ہے،

لیلاوتی حساب میں ہے فیضی نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی،

فیضی کی شاعری

فیضی فطرۃً شاعر تھا، اُس کا خاندان شاعری سے کچھ تعلق نہیں رکھتا تھا، تعلیم و تربیت بھی شاعری کی حیثیت سے نہیں ہوئی تھی، تاہم وہ بچپن ہی سے شعر کہتا تھا، لیکن چونکہ طبیعت مشکل پسند تھی اور عربیت کا زور تھا، اس لئے طبیعت زیادہ تر صنائع کی طرف مائل تھی، اپنا بچپن کا کلام کوئی شاعر محفوظ نہیں رکھتا، فیضی نے بھی ضائع کر دیا ہوگا لیکن ملا عبد القادر صاحب بدایونی کی بدولت ہم کو ایک غزل ہاتھ آئی ہے[1]،

اے قدِ نیکوے تو سروِ رواں	وے خمِ ابروے تو شکلِ کماں
حلقۂ گیسوے تو دامِ جنوں	طرۂ ہندوے تو کامِ جہاں
ہم لبِ جادوے تو آبِ حیات	ہم خطِ دلجوے تو خضرِ زماں

[1] بدایونی جلد ۳، تذکرہ محوی شاعر،

پانچ شعروں کی غزل ہے اور صنعت یہ ہے کہ باوجود صنعتِ ترصیع کے ہر شعر چار بحروں میں پڑھا جاتا ہے،

ابتدائیں جو قصیدے ہیں اُن میں عربی نامانوس الفاظ کثرت سے ہیں، اور یہ وہی ملّا ئیت کا زور ہے، مثلاً

یکے معلّمی شاہزادہ ہائے عظام | کہ بر نہالِ فلک می کنند اغصانی

کشمیر کا پورا قصیدہ دیکھو،

ایک قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفرج رونی کا تتبع کرتا تھا،

فیضی منم آں کہ در معانی | گامے بہ دو صد نہج گرفتم
تا کرد دلم عروجِ ہستی | نہ چرخ دسج درج گرفتم
ذوقے کہ تواں گرفت از شعر | از شعر ابوالفرج گرفتم

لیکن جس قدر اہلِ زبان سے اختلاط بڑھتا گیا، زبان سادہ اور صاف ہوتی گئی، عرفی، ظہوری، ملک قمی سے اکثر صحبتیں رہتی تھیں، خصوصاً عرفی کی زورِ طبع اور چاشنیِ سخن کا نہایت معترف ہے،

محتشم کاشانی کی تعریف میں لکھتا ہے،

حریف بافِ سخن محتشم کہ در کاشاں | بہ طرزِ تازۂ طرزِ سخنوری دارد
یکے ز نکتہ وراں گفت دیدم اشعارش | عبارتے ست کہ معنی سرسری دارد
بگفتمش سخنِ او عبارتے ست ولے | عبارتے کہ بہ معنی برابری دارد

ان باتوں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کی شاعری پر کن چیزوں کا اثر پڑا ہے،

فیضی نے قصیدہ، مثنوی، غزل سب کچھ کہا ہے لیکن قصیدے بے مزہ ہیں، ابتدائے

کلام ایک طرف اخیر کے قصائد سے بھی ملائیت کی بو آتی ہے، البتہ مثنوی اور غزل لاجواب ہے، اور انہی دونوں صنعت پر ہم ریویو کرنا چاہتے ہیں،

جوش بیان (۱) **فیضی** کی خصوصیات میں سب سے بڑھکر جوش بیان ہے جس کا وہ موجد بھی ہے اور خاتم بھی، جوشِ بیان **خواجہ حافظ** میں بھی ہے، اور اعلیٰ درجہ پہ ہے لیکن رندانہ مضامین اور دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ مخصوص ہے فیضی کے ہاں فخریہ عشقیہ فلسفیانہ ہر قسم کے مضامین ہیں، وہی جوش پایا جاتا ہے، جوشِ بیان اس کے ذاتی حالات کا خاص اثر ہے، جو کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتا تھا،

غور کرو ایک شخص جس کے سینے میں تمام علوم و فنون کے خزانے بھرے ہوئے ہیں، فلسفہ اور حکمت کے نہایت دقیق نکتوں تک اس کی نظر پہونچتی ہے، اور وہ دیکھتا ہے کہ اور حریف معمولی سطح سے آگے نہیں بڑھ سکتے، آزاد خیالی اور بلند نظری اس کو آسمان تک پہنچائے دیتی ہے، ان سب باتوں کے ساتھ قسمت کی یاوری نے اس کو تخت شاہی کے برابر کھڑا کر دیا ہے، ایسے شخص کے جوشِ مضامین کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے، جب وہ تخت شاہی کے پاس کھڑے ہو کر اکبر کو مخاطب کرتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک سیہ مست جوش مستی میں آپے سے باہر ہوا جاتا ہے، اور ننکار رہا ہے،

شاہنشاہا! خرد پژوہا!	دریا گہرا! فلک شکوہا!
بندے ست جہاں بہ عیش پیوست	دور تو شراب و آسماں مست
امروز بہ ایں نوائے چوں شہد	من بار بدم تو خسرو عہد
زیں خامہ کہ کرد و اہم فلک سائے	پیش تو ستادہ ام بیک پائے
ایں نامہ کہ عشق بر زباں برد	طغرائے ترا بہ آسماں برد

ایں چار ہزار گوہرِ ناب	کانگیختہ ام بہ آتشیں آب
بہ پذیر کہ آب گوہرِ تست	از بہر نثار افسرِ تست
پیمانۂ من اگر نشد پُر	دریا کنمت نثار ز ین دُر
گر عشق چنیں بسوزدم پاک	مہتاب بروں برآرم از خاک
بگداختہ آبگینۂ دل	آئینہ دہم بدستِ محفل
آنم کہ بہ سحر کاری ازرق	از شعلہ تراش کردہ ام حرف
بانگ قلم دریں شبِ تار	بس معنئ خفتہ کرد بیدار
ہر صبح بہ فیضِ بادشاہی	من بودم و بادِ صبح گاہی

اکبر نے جب نلدمن کی فرمایش کے لئے دربار میں بلایا ہے، اس حالت کو دیکھو کس جوش سے بیان کرتا ہے:۔

برخاستم از زمیں فلک تاز	برخاستہ موبمو بہ پرواز
چشمے کہ برہ گذار کردم	چشم دگرش نثار کردم
بگذشتم ازاں درِ ادب نیز	کونین گذاشتہ بہ دہلیز
دیدم دو جہاں بیک جہاں دُر	صد عمرِ ابد بیک زماں در
پیوند زمینیاں گسستم	نزدیک بہ آسماں نشستم

یہی جوش فلسفیانہ اور عشقیہ مضامین میں بھی قائم ہے،

اے عشق ار خصت ست کہ ز دوشِ آسماں	بر دوشِ خود نہم علمِ کبریائے تو
نظرِ فیض چو بر خاک نشینان فگنم	مور را مغز سلیماں رسد از قسمتِ ما
از تفِ بادِ دُعا بالِ ملائک بگداخت	وائے آں روز کہ برقے جہد از شیشۂ ما

روے کشادہ باید و پیشانیِ فراخ	آں جاکہ لطمہ ہاے ید اللہ می زنند
ایں چہ می بود کہ ساقی بقدح ریخت فرد	کہ مسیح و خضر از رشک کشاکش کردند
ہیرس اہلِ نظر چوں بعرش پیوستند	کہ پا بکنگرۂ دل نہادہ برجستند
عشق، صبر و خرد و ہوش زفیضی بربود	دزد در، بیں کہ بآں قافلہ سالارچہ کرد
شدیم خاک ولیکن ببوے تربتِ ما	تواں شناخت کزیں خاک مرد می خیزد
عشق تا پاے بیفشرد در اندیشۂ ما	ہمہ معشوق تراود زرگ و ریشۂ ما
بادہ در جوش ست و یاران منتظر	ساقیا! "خذ ما صفا دع ما کدر"
می کشد شعلہ سرے از دلِ صد پارۂ ما	جوشِ آتش بود امروز بفوارۂ ما
ہیچ دانی دلِ ما خرد چرا بشکستند	آسماں آئینہ ہا ساخت زسیارۂ ما
دریں دیار گروہے شکر لباں ہستند	کہ بادہ با نمک آمیختند و بد ستند
فیضی کفم تہی و رہ عاشقی بہ پیش	دیوانِ خود مگر بدو عالم گرد کنم

اقسامِ سخن میں فیضی فخریہ خوب کہتا ہے، اور اس عالم میں اس کا جوشِ بیان حد سے گذر جاتا ہے، ملاحظہ ہو،

امروز نہ شاعرم حکیمم	دانندۂ حادث و قدیمم
ہر موے ز من تمام گوش ست	خاموشیِ من بصد خروش ست
تا تازہ و تر زنم رقم را	در بادہ کشیدہ ام قلم را
ایں شیشہ نہادہ ام براں طاق	کاں جا نہ رسیدہ دست عشاق
اسراف معانیم نظر کن	زیں گنج بہ مفلساں خبر کن
می ریخت ز سحر کاری اثر رفت	از صبح ستارہ وز من حرف

دروازهٔ صبح بر رخم باز	کلکم ز شگاف پرتو انداز
این بادہ کہ جوشد از ایاغم	خونے ست چکیدہ از دماغم
صد دیدہ بورطهٔ دل افتاد	کیں موج گہر بہ ساحل فتاد
دکّان ہنر چنیں کشودن	سامانِ سخن چنیں نمودن
ایں کارِ من ست کارِ کس نیست	اندازهٔ اختیارِ کس نیست
چوں بر سپہم نظر فگندند	در معرکہ ام سپر فگندند
بر تافتم از درم سبک سیر	ناقوسِ برہمنانِ نہ دیر
بنگر کہ چیاں بصد تگ و تاز	بر تار معانیم رسن باز
ہر نغمہ کہ بستہ ام بریں تار	ناقوس نہفتہ ام بہ زنّار
ایں گل کہ بہ بوستاں نثاری ست	از من بہ بہار یادگاری است

(۳) فیضیؔ کی ممتاز خصوصیاتِ شاعری میں سے استعارات کی شوخی اور تشبیہات کی ندرت ہے، اکبری دور کے شعرا میں یہ خصوصیت عام ہے لیکن نوعیؔ شیرازی اور عرفیؔ اس وصف میں اپنے معاصرین سے ممتاز ہیں، اور فیضیؔ ممتاز تر ہے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس خاص وصف میں فیضی پر عرفیؔ کا اثر پڑا ہے، یا خود عرفیؔ نے فیضیؔ سے یہ شوخیاں سیکھی ہیں، ایک مستند ایرانی تذکرہ نویس نے فیضیؔ کے حق میں یہ فیصلہ کیا ہے لیکن چونکہ تذکرہ نویس صاحب فیضیؔ کے معاصر ہیں اور فیضیؔ دربار کا ملک الشعرار تھا، اس لئے خوشامد کے سوئے ظن کا موقع باقی رہتا ہے،

بہر حال استادی و شاگردی کی بحث نہیں لیکن فیضیؔ کی شوخی استعارات اور جدّتِ تشبیہات سے انکار نہیں ہو سکتا، مثالیں ملاحظہ ہوں،

بزمے ست جہاں بعیش پیوست | دور تو شراب و آسماں مست
زیں خامہ کہ کردہ ام فلک سائے | پیش تو ستادہ ام بیک پائے
گر عشق چنیں بسوز دم پاک | مہتاب بروں برآرم از خاک
بگداختہ آبگینۂ دل | آئینہ و ہم بدست محفل
بگداختہ ام دل و زباں را | کیں نقش نمودہ ام جہاں را
امروز بدودمانِ ایام | زد نوبت من سپہر بر بام
آنم کہ بہ سحر کاری ژرف | از شعلۂ تراش کردہ ام حرف
بانگ قلمم دریں شب تار | بس معنی خفتہ کرد بیدار
برخاستم از زمیں فلک تاز | برخاستہ مو بمو بہ پرواز

(۳) وہ اکثر فلسفیانہ مضامین باندھتا ہے جس کے ساتھ ادعا اور غرور کی جھلک بھی ہوتی ہے۔

گویند ہمرہانِ طریقت کہ اے رفیق | آگاہ شو کہ قافلہ ناگاہ می زنند
روے کشادہ باید و پیشانیِ فراخ | آں جا کہ لطمہ ہائے یداللہ می زنند

اس شعر کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ جہاں خدا کے ہاتھ کے طمانچے پڑتے ہیں وہاں شگفتہ روئی اور کشادہ جبینی درکار ہے مطلب یہ ہے کہ صدمات قضا و قدر کی برداشت یا تجلیات کی برق افگنی کے لئے نہایت صبر و استقلال درکار ہے۔

عجب تر از دلِ فیضی ندیدہ ایم طلسم | کہ ہم گہر بود و ہم محیط و ہم غواص
چہ کشمہاست کہ در زلف بتاں تعبیہ شد | کز حقیقت دو جہاں رو بہ مجاز آوردند
گردے گم شود از حلقۂ عشاق بپرس | ہرچہ بردند دریں قافلہ باز آوردند

عشق تا پاے بیفشرد در اندیشۂ ما	ہمہ معشوق تراود ز رگ و ریشۂ ما
مسافرانِ طریقت ز من جدا شویدکہ	دور بینم و چشمم بہ منزل افتادہ است
غافل نیم ز راہ و لے آہ چارہ چیست	زیں رہزناں کہ بر دلِ آگاہ می زنند
اگر سرے نہ کشیم سوے بیخودی چہ کنم	مرا ز ہمدمیِ خود ملال می گیرد
بگریز کہ دورانِ فلک عربدہ خیز ست	آئینِ حریفاں ہمہ کج دار و مریز ست
در دشتِ آرزو بنود ہیچ دام و دد	راہے ست ایں کہ ہم ز تو خیزد بلاے تو
خاک بیزانِ رہِ فقر بہ جاے نزوند	گوئی ایں طائفہ ایں جا گہرے یافتہ اند

فیضی کے دل میں فلسفیانہ خیالات کا جب زور ہوتا ہے، اور ان کے اظہار سے بجز وہ مجبور ہوتا ہے تو اس مجبوری کو عجب انداز سے ظاہر کرتا ہے،

فلسفیانہ مسائل اسکے دل و دماغ میں بھر گئے ہیں، چاہتا ہے کہ ظاہر کرے لیکن جانتا ہے کہ لب ہلے اور ظاہر بیں علما، قابو سے جاتے رہے، چونکہ علماء ہی کے گروہ میں زندگی بسر کی ہے، اور اپنے آپ کو اس دائرہ سے باہر نکالنا نہیں چاہتا، اس لیئے چاہتا ہی کہ اصل حقیقت بھی ظاہر کی جائے اور رسم فنون کا ساتھ بھی نہ چھوٹنے پائے لیکن کیونکر ہو سکتا ہے مجبوراً ساتھیوں سے انقطاع پر آمادہ ہوتا ہے، اور کہتا ہے،

آں نیست کہ من ہم نفساں را بگذارم	با آبلہ پایاں چہ کنم قافلہ تیز است

اسی مضمون کو ایک اور پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

فیضی از قافلۂ کعبہ روان نیست بروں	ایں قدر ہست کہ از ما قدمے در پیش ست

بعض وقت اس کو خیال آتا ہے کہ مسلمان بت پرستی کے دشمن ہیں لیکن کعبہ کی در و دیوار کی تعظیم میں ان کا جو طریقِ عمل ہے، اس میں ظاہر پرستی کا صاف شائبہ پایا جاتا ہے

اس خیال کو یوں ادا کرتا ہے،

آں کہ می کرد مرا منع پرستیدن بت | درحرم رفتہ طواف در و دیوار چہ کرد

پھر غور کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ نہیں کعبہ پرستوں کی یہ اخیر منزل نہیں مقصود اصلی وہی ذاتِ بحت ہے لیکن مبتدیوں کو ان ابتدائی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے، اس بنا پر کہتا ہے:۔

کعبہ را ویراں مکن اے عشق کانجا یک نفس | گہ گہے پس ماندگانِ راہ منزل می کنند

(۴) غزل میں عام شعراء کا قاعدہ ہے کہ کوئی قدیم طرح سامنے رکھ لیتے ہیں، پھر ایک ایک قافیہ پر نظر ڈالتے ہیں، اور جو قافیہ جس انداز سے بندھ سکتا ہے باندھتے جاتے ہیں، رفتہ رفتہ غزل پوری ہو جاتی ہے، یہ بہت کم ہوتا ہے کہ پہلے کوئی مسلسل یا مفرد خیال دل میں آئے اُس کو شعر میں ادا کر دیں، پھر غزل پوری کرنے کے لئے اور اشعار بھی لکھتے جائیں لیکن فیضی کی اکثر غزلوں میں صاف نظر آتا ہے کہ کسی واقعہ کے اثر سے کوئی خیال دل میں آتا ہے، اور اسی کو وہ ادا کر دیتا ہے خطوط میں جا بجا لکھتا ہے کہ فلاں واقعہ نے یہ خیال پیدا کیا، اور وہ غزل کی صورت میں ادا ہوا، مثلاً دکن کے سفر میں ایک دفعہ کچھ ہنگامہ ہوا، لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے فیضی نے بہت روکا کسی نے نہ سنا، اس وقت بے اختیار اُس کی زبان سے یہ غزل ادا ہوئی،

باز یارانِ طریقت سفرے در پیش است | رہ نوردانِ بلا را خطرے در پیش است

کس نمی گویدم از منزلِ اوّل خبرے | صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش است

ہمرہاں ایں ہمہ نومید نباشید از من | کہ دعائے سحرم را اثرے در پیش است

ما نہ آنیم کہ نادیدہ قدم بگذاریم | شکر کن قافلہ را راہبرے در پیش است

اے صبا! بر سرِ آفاقِ گلِ مژدہ بریز | کہ شبِ تیرۂ ما را سحرے در پیش است
فیضی از قافلۂ کعبہ رواں بیروں نیست | ایں قدر ہست کہ از ما قدمے در پیش است

اسی طرح اکبر جب گجرات کی مہم سے آیا ہے تو ایک غزل لکھی ہے جس کا مطلع یہ ہے

نسیمِ خوشدلی از فتحپور می آید | کہ بادشاہِ من از راہِ دور می آید

احمد آبادِ گجرات میں پہونچا ہے، تو وہاں کے دلفریب حسن نے اس پر ایک خاص اثر کیا ہے، وہی غزل میں ادا کرتا ہے،

منم کہ کشتۂ گجراتیان بیدادم | خرابِ عشوۂ خوبانِ احمد آبادم
سہی قدے ز سرِ ناز جلوۂ تنمود | کہ ہیچو سایہ بدنبالِ آں نیفتادم
بہر طرف کہ خرامید سروِ آزادی | غلامِ او شدم و خطِ بندگی دادم
چو رشکِ گلشنِ فردوس احمد آباد است | از و مباد برونم کشند چون آدم
بہ حسنِ مردمِ گجرات یاد نیست ولے | نمی روند جوانانِ دہلی از یادم

لیکن انصاف یہ ہے کہ ایک حکیم، ایک فلسفی، ایک ادیب عشق کی کڑیاں نہیں جھیل سکتا

بہ سوزِ عشق، شاہانِ راچہ کار است | کہ سنگِ لعل، خالی از شرار است

اس بنا پر فیضی کے عشقیہ اشعار میں وہ سوز و گداز نہیں، جو عاشق تن شعرا کا خاصہ ہے، نظیری فتنہ گر ان گجرات کی شان میں کچھ کہتا تو تم دیکھتے کہ سننے والے دل تھام کر رہ جاتے،

بہر حال فیضی کے تغزل کا اندازہ کرنا چاہو تو اشعار ذیل سے کر سکتے ہو،

انچہ فیضی نظر دوست کرد | مشکل اگر دشمن جانی کند
ناشکری عشق چہ تواں کرد | غم بر سرِ غم فزود مارا

حیران فسون سازی عشقم کہ خیالت — از دیدہ درون آید و در سینہ نگنجد

شب وصل کے ذکر میں ایک غزل لکھی ہے، دو شعر سننے کے قابل ہیں،

نہ گویم اے فلک از کجروی ہایت تو برگردی — شب وصل است خواہم اندکے آہستہ تر گردی

نہ مہتاب رخش کاشانۂ من روشن است امشب — اگر وقت طلوعت آید اے خورشید برگردی

عُرفی شیرازی[1]
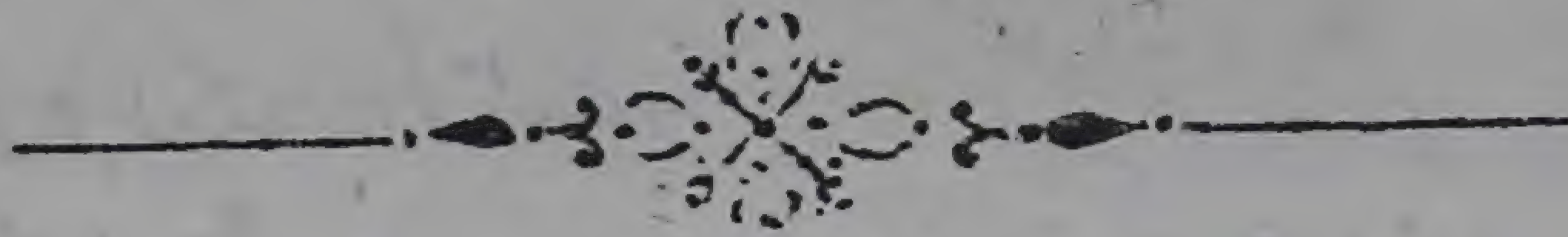
عرفی کا نام ونسب | محمد نام جمال الدین لقب، عرفی تخلص، باپ کا نام زین الدین بلوی اور دادا کا جمال الدین چادر باف تھا، ایران میں ان محکمہ جات اور عدالتوں کو جو مذہبی صیغہ سے تعلق نہیں رکھتیں "عرف" کہتے ہیں، عرفی کا باپ شیراز کے دار الحکومت میں ایک معزز عہدے پر ممتاز تھا، عرفی نے اسی مناسبت سے اپنا تخلص عرفی رکھا تھا، مآثر رحیمی میں ہے،

"چوں پدرش بعض اوقات در دیوان حکام فارس بہ امر وزارت داروغہ دار الافاضل شیراز مشغولی می نمود، مناسبت شرعی عرفی را منظور داشتہ تخلصِ خود عُرفی کرد"

اس تخلص کے اختیار کرنے کے بعد اس قدر اور کہنا ضرور ہے کہ عرفی فطرۃً مغرور اور خود ستا تھا، چونکہ ایران کے اکثر شعرا معمولی خاندانوں سے تھے، مثلاً خاقانی بڑھئی تھا، فردوسی باغبانی کرتا تھا، باقر کاشانی خردہ فروش تھا، برخلاف اس کے عرفی ایک معزز خاندان کا

---

[1] عرفی کے حالات اگرچہ مختصراً عام تذکروں میں ملتے ہیں لیکن مستند اور دلچسپ واقعات مآثر رحیمی اور تذکرۂ عرفات اوحدی کے سوا اور کسی تذکرہ میں نہیں پائے جاتے، مآثر رحیمی اصل میں عبدالرحیم خانخاناں کی سوانحعمری ہے لیکن اس میں تمام اُن شعرا اور اہلِ فن کا تذکرہ ہے، جو خانخاناں کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، اس کتاب کا مصنف خود اُن شعرا کا ہمعصر تھا، اس لئے دلچسپ حالات بہم پہونچائے ہیں، اور اکثر واقعات چشم دید لکھے ہیں، عرفات کا مصنف بھی قریب قریب اسی زمانے میں تھا، اور اس نے عرفی کو تیس برس کی عمر میں دیکھا تھا، یہ دونوں کتابیں میرے پیش نظر ہیں،

آدمی تھا، اور اُس کا باپ سرکاری محکمہ سے بھی تعلق رکھتا تھا، اس لئے تخلص میں بھی فخر کی ادا قائم رکھی، عرفی نے نام و نسب پر اکثر فخر کیا ہے اور یہ بھی اس کے خصوصیات میں ہے، ورنہ ایران کے شعرا میں نسب کا فخر بہت ہی شاذ و نادر پایا جاتا ہے،

عرفی کی تعلیم و تربیت شیراز میں ہوئی، شاہ نواز خاں (مصنف مآثر الامرا) نے تذکرۂ بہارستان سخن میں لکھا ہے کہ عرفی نے علاوہ عمومی علوم کے مصوری و نقاشی کی بھی تعلیم پائی تھی، عرفی نے جب ہوش سنبھالا تو سلطنت صفویہ کا شباب تھا اور طہماسپ و عباس کی علم پروری نے تمام ایران کو علم و ہنر کی نمائش گاہ بنا دیا تھا، بالخصوص شاعری بڑے زوروں پر تھی محتشم کاشی، وحشی یزدی، غیرتی وغیرہ نے فغانی کی طرز کو اور زیادہ شوخ کر دیا تھا، اور تمام ملک ان کی زمزمہ سنجیوں سے گونج اٹھا تھا، عرفی نے بھی اپنے اظہار کمال کے لئے یہی میدان پسند کیا، اور باوجود کم سنی کے بڑے بڑے پرانے استادوں کے ساتھ معرکہ آرائی شروع کر دی، اس زمانے میں فغانی کی اکثر غزلیں طرح کی جاتی تھیں اور محتشم کاشی وغیرہ ان میں غزلیں لکھتے تھے، عرفی بھی انہی طرحوں پر غزلیں لکھتا تھا اور عام مشاعروں میں بے باکانہ پڑھتا تھا، وحشی یزدی یزد میں سکونت رکھتا تھا، اس لئے اس سے تحریری مناظرات رہتے تھے، اوحدی نے لکھا ہے کہ جب میں شیراز گیا تو مشہور شعراء کے نام دریافت کئے، لوگوں نے غیرتی کا پتہ دیا، شیراز میں ایک دوکان تھی جو شعرا کا دنگل تھا، یہاں عارف لاہجی، حسین کاشی مورخ، میر ابو تراب تقیائے ششتری، مخاطب بہ مورخ خاں، رضائی کاشی وغیرہ مشاعرے کرتے تھے، مشاعرہ میں غیرتی اور عرفی سے مباحثہ ہوا، عرفی نے دعوی کے دونوں پہلو مخالف اور موافق دیئے اور دونوں میں غیرتی پر غالب آیا،

عرفی کی قدر دانی کے لئے اگرچہ ایران میں بھی کچھ کم سامان نہ تھا، تاہم ہندوستان کی سی بات کہاں نصیب ہو سکتی تھی، جس کی بدولت ایران کے ہر ہر گوشے سے اہل فن کھنچے چلے آتے تھے،

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ عرفی شہزادہ سلیم کے حسن پر غائبانہ عاشق ہو کر آیا، پھر اُس نے ہندوستان کا رُخ کیا، راستہ میں ڈاکہ پڑا اور اس کی کل کائنات جاتی رہی، اس پر یہ رباعی لکھی:

دوشینہ کہ بر در بر دوشم بود | زانو چو عروس نو در آغوشم بود
پوشیدنئی، نہ داشتم غیر از چشم | چیزے کہ بزیر سر نہم گوشم بود

ہندوستان میں اگرچہ سیکڑوں امرا اور اہلِ دل تھے، لیکن عرفی نے ان سب میں فیضی کو انتخاب کیا، جس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ اس کے دربار تک پہنچنا آسان تھا، یا یہ کہ سخن شناسی کی جو توقع فیضی سے ہو سکتی تھی اور کسی سے نہیں ہو سکتی تھی، عرفی فتحپور سیکری ہیں فیضی سے ملا، فیضی نے اس کی پوری قدردانی کی، پنجاب کے سفر میں وہ اٹک تک فیضی کے ہمرکاب رہا اور اسکی تمام ضروریات فیضی ہی کی سرکار سے انجام پاتی رہیں[1] لیکن عرفی کی نخوت پرستی کی وجہ سے صحبت برآر نہ ہو سکی، اور بالآخر اس دربار سے قطع تعلق کرنا پڑا،

اس زمانہ میں اکبری دربار کے نورتن سب موجود تھے، ان میں حکیم ابو الفتح گیلانی اگرچہ ظاہری منصب و اقتدار کے لحاظ سے سب سے کم پایہ تھا یعنی صرف ہزاری منصب رکھتا تھا لیکن بڑا عالم اور علم و فضل کا بڑا قدردان تھا، اس کے ساتھ عرفی کا ہم وطن اور ہم مذہب تھا، اِن خصوصیات کی بنا پر اُس نے اسی کو ترجیح دی اور قصیدۂ مدحیہ لکھ کر پیش کیا،

---

[1] تاریخ بدایونی،

یہ پہلا دن تھا کہ عرفی کے غرور کی آن ٹوٹی، غالباً خود عرفی کو بھی اس کا سخت صدمہ ہوا، چنانچہ قصیدہ میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں،

چونکہ حکیم ابوالفتح بڑا نکتہ شناس اور نقادِ فن تھا، عرفی نے اس کے فیضِ صحبت سے بہت ترقی کی، حکیم ابوالفتح نے ایک رقعہ میں جو خانخاناں کے نام ہے، یہ الفاظ لکھے ہیں :-

"ملا عرفی و ملا حیاتی بسیار ترقی کردہ اند" [۱]

اللہ اکبر! ایک وہ زمانہ تھا کہ امراء اور اہلِ دول علم وفضل میں یہ پایہ رکھتے تھے کہ عرفی جیسے اہلِ کمال اُن کی صحبت سے مستفید ہو سکتے تھے، عرفی نے بھی حکیم ابوالفتح کی احسانمندی کا پورا حق ادا کیا، جس زور کے قصیدے حکیم صاحب کی شان میں لکھے اکبر و خانخاناں کی مدح میں بھی نہیں لکھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک ابوالفتح زندہ رہا اس نے خود اپنی خواہش سے کسی دربار کی طرف رُخ نہیں کیا،

حکیم ابوالفتح اور خانخاناں سے نہایت درجہ کا اتحاد تھا، حکیم موصوف کی فرمایش سے عرفی نے خانخاناں کی مدح میں قصیدہ لکھا ہے، جس کا مطلع یہ ہے، ع

بیا کہ باد لم آں می کند پریشانی

اس قصیدہ میں اس واقعہ کا نہایت لطیف پیرایہ میں ذکر کیا ہے، چنانچہ کہتا ہے،

اذاں نہ دیدہ ثنا گوئیت کہ می بینم	ترا داور اکیتن بچشم روحانی
دلیل و صدقم ایں بس کہ مدح خود نہ بخواست	مرا بمدحِ تو فرمود گوہر افشانی

حکیم ابوالفتح نے ۹۹۷ھ میں انتقال کیا، عرفی پر اس واقعہ کا سخت اثر ہوا، چنانچہ اس زمانہ میں خانخاناں کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے، اس میں کہتا ہے:

---

[۱] خزانہ عامرہ ذکر حیاتی گیلانی،

چہ احتیاج کہ گویم کہ مرد عرفی را | چہ بر سرا ز ہوس مرگ ناگہاں آمد

برفت و لطف تو بر من گذاشت ایں بیتے | بہ نزد عقل کہ تا واں آں زباں آمد

تو آگہی کہ مرا از غروب ایں خورشید (یعنی ابو الفتح) | چہ گنجہاے سعادت زیانِ جاں آمد

حکیم ابو الفتح کے مرنے کے بعد عرفی، خانخاناں کے درباریوں میں داخل ہوا، اور پھر خاندان شاہی کے سوا اور کسی کے آستانہ پر کبھی سر نہیں جھکایا، چنانچہ خود فخریہ کہتا ہے،

یک منعم و یک نعمت و یک منت و یک شکر | صد شکر کہ تقدیر چنیں راندہ قلم را

خانخاناں امرائے اکبری کا گل سر سبد تھا، اس زمانے میں وہی ایک شخص تھا، جس کے تاجِ فخر پر صاحب السیف و القلم کا طرہ زیب دیتا تھا، گجرات کی فتح جس میں اس نے دس ہزار فوج سے چالیس ہزار کی جمعیت کو شکست دی، اس کی شجاعت کا ایک معمولی کارنامہ ہے، خود شاعر اور شعراء کا بڑا قدر دان تھا، عبد الباقی نہاوندی نے اس کے مفصل حالات دو جلدوں میں لکھے ہیں، ایک جلد میں صرف اس کے دربار کے شعراء اور اہلِ کمال کا تذکرہ ہے۔

عرفی نے خانخاناں کے دربار میں پہونچ کر خاطر خواہ ترقی کی، مآثر رحیمی میں لکھا ہے :-

"بہ اندک فرصتے بہ یمن تربیت و شاگردی و مداحی ایں دانای رموز پختگی تمام و ترقی مالا کلام در منظوماتش بہم رسید"

چونکہ خانخاناں کے دربار میں بڑے بڑے نامور شعراء مثلاً نظیری نیشاپوری، شکیبی اصفہانی، نیسی، ظہوری وغیرہ سے مقابلہ رہتا تھا، عرفی کا کلام روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا، یہاں تک کہ تقرب اور اختصاص میں بھی وہ حریفوں کی صف کو چیرتا ہوا آگے نکل گیا، یہ بات اسی کو

نصیب ہوئی کہ دربار میں جاتا تھا تو عام طریقہ پر آداب و کورنش نہیں بجالاتا تھا، اور جس جگہ جس طرح چاہتا تھا بیٹھ جاتا تھا، مآثر رحیمی میں ہے،

"در ایام ملازمت تسلیم و کورنشے کہ در ہندوستان متعارف ست کہ بعوض سلام بصاجان می کنند بہ صاحب خود نمی کرد، و بہر طرف طور و روشے کہ بخواست در مجالس می نشست، و اہلِ عالم تقدیم او را قبول می نمودند"

خانخاناں نے عرفی کے ساتھ وقتاً فوقتاً جو فیاضیاں کیں، اس کی ایک ادنی مثال یہ ہے کہ ایک قصیدے پر ستر ہزار روپیے انعام دلوائے[1]

عرفی نے اگرچہ خانخاناں کے سوا امراء اور اہلِ دربار میں سے کسی کی مدح سرائی گوارا نہ کی لیکن فرماں روائے وقت سے یہ بے نیازی ممکن نہ تھی، اس لئے خود اپنی خواہش یا خانخاناں کی فرمایش سے اکبر کی مدح میں اس نے متعدد قصائد لکھے لیکن ابو الفضل اور فیضی کے آگے اس کا چراغ نہیں چل سکتا تھا، ابو الفضل نے اکبر نامہ اور آئینِ اکبری دونوں میں اس کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس طرح کہ نہ کرتا تو اچھا تھا، اکبر نامہ میں لکھتا ہے :۔

"درے از سخن سرائی بر و کشودہ بودند در خود نگریست و بر باستانیان زبان طعن کشود، غنچۂ استعداد ناشگفتہ پژمردہ"

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عرفی حد سے زیادہ مغرور اور خود ستا تھا، اور اساتذۂ سلف کا نام اپنے مقابلہ میں تحقیر سے لیتا تھا، چنانچہ کہتا ہے،

انصاف بدہ بو الفرج و انوری امروز	بہر چہ غنیمت نشمارند عدم را
روح اللہ ز اعجاز نفس شمن شاں باد	تا من قلم انداز م و گیرند قلم را

[1] خزانۂ عامرہ تذکرۂ عرفی

تفرج کہ من از بہرِ روح سازد ہم | نہ انوری نہ فلانی دہد نہ ہمانی

نازشِ سعدی بہ مشتِ خاکِ شیراز از چہ بود | گر نمی دانست باشد مولد و ماوائے من

دم عیسیٰ تمنا داشت خاقانی کہ برخیزد | بہ امداد صبا اینک فرستادم بشیروانش

اس کے فخر و غرور سے تمام ہمعصر نالاں تھے، یہاں تک کہ نظیری نیشاپوری جو ایک مرنج مرنجاں شاعر تھا، اس سے بھی ضبط نہ ہو سکا، چنانچہ ایک قصیدہ میں جو عرفی کے مرنے کے بعد اس کے جواب میں لکھا ہے، کہتا ہے،

دریں قصیدہ بہ گستاخی ارچہ عرفی گفت | بداغِ رشک پس از مرگ سوخت خاقانی

کنوں بگور چناں او برشک می سوزد | کہ در تنور، تواں گوسفند بریانی

قصیدۂ کشمیریہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اکبر نے ۹۹۹ھ ہجری میں کشمیر کا جو سفر کیا تھا اُس میں عرفی بھی ہمرکاب تھا، ایک قطعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اکبر نے کسی موقع پر ایک گھوڑا بھی انعام میں دیا تھا، لیکن عرفی نے بجائے اس کے کہ شکر کا اظہار کرتا اُلٹے گھوڑے کی ہجو لکھی،

شاہنشاہا حقیقتِ اسپے کہ دادۂ | بشنو ز لطف تا برسانم بعز عرض

ہستم براو سوار ولیکن پیادہ ام | گاہے بطول می زدم اکنون دم بعرض

خانخاناں اور اکبر کے سوا عرفی نے کسی اور آستانہ کی ناصیہ سائی کی تو وہ شاہزادہ سلیم تھا، اور عرفی کی تاریخ زندگی میں یہ واقعہ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے، تمام تذکرے متفق ہیں کہ عرفی شہزادۂ مذکور کا جان دادہ تھا، یہ امر اگرچہ بظاہر بالکل خلافِ قیاس ہے لیکن عرفی کے قصائد میں بے شبہہ یہ جھلک پائی جاتی ہے، شاہزادۂ موصوف کی شان میں اس کے جو قصیدے ہیں ان کے دیکھنے سے صاف نظر آتا ہے کہ یہ اور کوئی جوش ہے جس کا رنگ مداحی کے لباس میں بھی جھلک رہا ہے، عرفی کو اس خوش قسمتی پر ناز

ہو سکتا ہے کہ شہزادہ نے خود اس کو یاد کیا، اور دربار میں بلا کر قصیدہ لکھنے کی فرمایش کی، عرفی جس شان سے دربار میں پہنچا ہے اور شہزادہ نے جس طرح اس سے نگاہ پنہاں کی زبان سے باتیں کی ہیں، اسکی تصویر خود عرفی نے نہایت خوبی سے کھینچی ہے،

کہ ناگہاں ز درم در رسید مژدہ دہے
چنانکہ از چمن طالعم بعنبر شمیم

چہ گفت، گفت کہ "ای مخزنِ جواہر قدس"
چہ گفت، گفت "اے مطلبِ بہشتِ نعیم"

بیا کہ از گہرت یاد می کند دریا
بیا کہ تشنۂ لبت را طلب کند تسنیم

برہ فتادم و گشتم چناں شتاب زدہ
کہ دستِ اہل کرم در نثار گوہر و سیم

مرا چو دوش بدوشِ ادب بدید استاد
بالطفِ خاص بدل کرد التفاتِ عمیم

رموز کورنش و تسلیم را ادا کردم
بہ ادب مردم دانا و بذلہ سنج ندیم

نگفت دمن بشنودم ہر آنچہ گفتن داشت
در بیان نگہش کرد بر زباں تقدیم

لبش چو نوبتِ خویش از نگاہ باز گرفت
فتاد سامعہ در موجِ کوثر و تسنیم

اخیر کے دونوں شعروں کا مطلب یہ ہے:۔

"شہزادہ نے کچھ نہیں کہا اور میں نے سُن لیا، کیونکہ تقریر کرنے میں اسکی نگاہ نے زبان پر پیش دستی کی، پھر جب نگاہ سے گذر کر ہونٹوں کی باری آئی تو میرے کان کوثر تسنیم کی موجوں میں ڈوب گئے"

شیخ سعدی نے ایک قطعہ میں یہ مضمون باندھا تھا کہ اُس شاعر کو عاشقی کا نام نہ لینا چاہئے جو قصیدہ میں دو چار شعر عشقیہ کہہ کر مداحی شروع کر دیتا ہے، عرفی نے اس پر ایک قطعہ لکھا ہے، اُس میں شہزادہ سلیم کی معشوقی کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے،

دی کسے گفت کہ سعدی گہر افروز سخن
قطعۂ گفت کہ اندیشہ بر اں می نازد

سخنِ عشق حرام ست بر اں بیہدہ گوے
که چودہ بیتِ غزل گفت مدیح آغازد

گفتم ایں خود ہمہ عیب ست که در راہِ تمیز
ہر کہ ایں لاف زند رخشِ دوئی می تازد

نوحش اللہ زپاک اندیشیِ عرفی کورا
آنکه ممدوح بود عشق بہ او می نازد

:یعنی سعدی گو ممدوح کو معشوق پر ترجیح نہیں دیتے لیکن بہر حال معشوق

کے علاوہ ان کا کوئی ممدوح بھی ہے لیکن میرا تو ممدوح بھی وہی ہے جو معشوق ہے،

وفات | تذکرۂ داغستانی وغیرہ میں لکھا ہے کہ حاسدوں نے اس کو زہر دیدیا بعضوں نے لکھا ہے کہ زہر دینے کی وجہ شہزادہ سلیم کے ساتھ عشق کا اظہار تھا، ابو الفضل نے اکبر نامہ میں ۹۹۹ ہجری کے واقعات کے ذیل میں لکھا ہے:۔

"سیزدہم، عرفی شیرازی رخت ہستی بربست، درے از سخن سرائی بر روے کشودہ بودند، اگر در خودنگرستے زندگی را بشایستگی سپردے و زمانہ لختے فرصت دادے کار او بلند، دریں نزدیکی ایں رُباعی برسنجیدہ بود"

عرفی دم نزع است و ہماں مستی تو
آیا بچہ مایہ رخت بربستی تو

فردا است کہ دوست نقد فردوس بکف
جویاے متاعے ست و تہیدستی تو

انتقال کے وقت اُس کی عمر ۳۶ برس کی تھی،

تذکرۂ داغستانی میں لکھا ہے کہ لاہور میں مدفون ہوا، اور چند روز کے بعد کوئی درویش کسی اور بزرگ کے دھوکے میں اس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر نجف میں لے گیا، اور وہاں دفن کردیں لیکن یہ غلط ہے، عبد الباقی نے جو خود عرفی کا معاصر تھا، ماثر رحیمی میں لکھا ہے کہ میر صابر اصفہانی نے جو اعتماد الدولہ غیاث بیگ (وزیر اور خسر جہانگیر بادشاہ) کا درباری تھا، ایک قلندر کو رقم کثیر دی کہ عرفی کی ہڈیاں لاہور سے نجف لیجائے، بہر حال عرفی کی

یہ پیشین گوئی پوری ہوئی،

بکاوشِ مژہ از گور تا نجف بردم	اگر بہند ہلاکم کنی وگر بہ تتار

ملا رونقی ہمدانی نے اس واقعہ کی تاریخ میں یہ قطعہ لکھا،

یگانہ گوہر دریائے معرفت عرفی	کہ آسمان پے پروردنش صدف آمد
بکاوشِ مژہ از گور تا نجف بردم	زدہ است تیر دعائے بر ہدف آمد
رقم زد از پے تاریخ رونقی کلکم	بکاوشِ مژہ از گور تا نجف آمد

اخلاق و عادات عرفی کے اخلاق و عادات میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ فخر و غرور و کم بینی، خود ستائی ہے، اس کے معتقدین خاص تک اس کے غرور سے نالاں ہیں، بدایونی نے فیضی کے توڑ پہ اس کو بہت چکایا ہے، تاہم یہ لکھنا پڑا:۔

"اما از بس عجب و نخوت کہ پیدا کرد از دلہا افتاد"

معلوم ہوتا ہے کہ اس رعونت نے تمام لوگوں کو اس کا دشمن بنا دیا تھا، ایک دفعہ بیمار ہوا (اور شاید یہ وہی مرض الموت کی بیماری تھی)، لوگ عیادت کو آئے لیکن چونکہ دل صاف نہ تھے غمخواری کے لہجہ میں جو بات کہتے تھے اُس میں دل آزاری کا پہلو ہوتا تھا، عرفی بھی سمجھتا تھا اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا تھا، اسی حالت میں ایک قطعہ لکھا جس میں مرض کی شدت بیان کرکے لوگوں کی ستم ظریفانہ بیمار پُرسی کی تصویر کھینچی ہے، عرفی عالمِ تخیل کی بلندی سے نیچے نہیں آتا، لیکن اس قطعہ میں واقعہ نگاری اختیار کی ہے اور سماں باندھ دیا ہے،

تن اوفتادہ دریں حال و دوستانِ فصیح	بہ دورِ بالش و بستر ستادہ چوں منبر
یکے بہ ریش کشد دست و کج کند گردن	کہ روزگار وفا با کہ کرد؟ جانِ پدر

به جاه و مال فرومایه، دلِ بناید بست | کجاست دولتِ جمشید و نامِ اسکندر
یکے بہ نرمی آواز و گفت و گوی حزین | کنند شروع و کشند آستین بدیدهٔ تر
کہ جانِ من! ہمہ را این رہ ست باید رفت | تمام راه روانیم و در ہر راکب بر
یکے بہ چرب زبانی سخن طراز شود | کہ اے وفات تو تاریخ انقلاب جہر
فراہم آی و پریشان مدار دل زنہار | کہ نظم و نثرِ تو من جمع می کنم یکسر
پس از نوشتن و تصحیح می کنم انشا | بہ مدعاے تو دیباچۂ چو درج گہر
چنانچہ ہستی فہرست دانش و فرہنگ | چنانچہ ہستی مجموعۂ صفات و ہنر
بہ نظم و نثر درآویزم و فرو ریزم | اگرچہ حصرِ کمالِ تو نیست حدِ بشر

ان سب کے جواب میں عُرفی جل کر کہتا ہے،

خداے عزّ و جل صحتم دہد بینی | کہ این منافقگان را چہ آورم بر سر

نہایت حاضر جواب اور ظریف الطبع تھا، ایک دفعہ ابوالفضل کے گھر پر اس سے ملنے گیا، دیکھا تو ابوالفضل قلم دانتوں میں دابے ہوئے سوچ میں بیٹھا ہے، سبب پوچھا، ابوالفضل نے کہا بھائی صاحب کی تفسیر بے نقط کا دیباچہ اُسی صنعت میں لکھ رہا ہوں، ایک موقع پر والد کا نام آگیا ہے، چاہتا ہوں کہ نام بھی آئے اور صنعت کا التزام بھی ہاتھ سے نہ جائے، عرفی نے کہا تردد کی کیا بات ہے، اپنے لہجہ میں ممارک لکھ دیجئے (مبارک نام تھا جس کو گنوار ممارک کہتے ہیں)

ایک دفعہ فیضی بیمار تھا، عرفی عیادت کو گیا، فیضی کو کتوں سے بہت شوق تھا، چند سگ بچے گلے میں سونے کے پٹے ڈالے پھر رہے تھے، عرفی نے کہا،

"مخدوم زادہا بہ چہ اسم موسوم اند؟"

فیضی نے کہا یہ اسم عرفی یعنی معمولی نام ہیں،

عرفی نے کہا مبارک باشد[1]

ظہوری سے اکثر دوستانہ خط وکتابت رہتی تھی، ایک دفعہ ظہوری نے کشمیر کی شال تحفہ میں بھیجی؛ غالباً شال معمولی درجہ کی تھی، عرفی نے جواب میں رقعہ لکھا جس میں تین رباعیاں شال کی ہجو میں تھیں، ایک یہ[2] ہے،

ایں شال کہ وصفش نہ حد تقریر است	آیات رعونت مرا تفسیر است
نامش نہ کنی قماش کشمیر گزد	صد رخنہ بکار مردم کشمیر است

عرفی کی بد اخلاقی کے سب شاکی ہیں لیکن تعجب ہے کہ فیضی نے جو اس کا سب سے بڑا حریف کہا جاتا ہے عرفی کی شریف النفسی کی نہایت تعریف کی ہے، چنانچہ اپنے رقعہ میں جسکی پوری عبارت آگے چل کر آئے گی لکھتا ہے:۔

"واز تہذیب اخلاق چگوید کہ: رخاکی نہاد شیرانہ ذاتی می باشد کہی"

شاید یہ ابتدائی ملاقات کا حال ہوگا، جب فیضی کو پورا تجربہ نہیں ہوا تھا،

معلوم ہوتا ہے کہ عرفی بخلاف اور شعراء کے رند اور اوباش نہ تھا، کسی نے اس کو فسق کا الزام دیا تھا، اس پر اس کو سخت صدمہ ہوا، ایک قطعہ میں اس کا اظہار کیا ہے، اور خاتمہ میں اپنے دل کو اس طرح تسلی دی ہے،

اہل دنیا ہمگی تہمت گیرند و فساد	عیسیٰ ایں را تحمل شد و مریم برداشت

باوجود بدمزاجی اور غرور کے عرفی نے کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں کی، یا کسی

[1] یہ دونوں واقعات خافی خاں نے حالات اکبر واقعات ۹۹۹ھ میں لکھے ہیں (خافی خاں ...) دوسرا واقعہ بدایونی میں بھی مذکور ہے [2] خزانہ عامرہ ذکر ظہوری،

کو اس قابل نہیں سمجھتا ہوگا، ایک قصیدہ میں بہت جل کر کہا ہے، تو صرف اس حد تک اکتفا کیا ہے ا۔

با من از جہل معارض شدہ نامنفعلے

تصنیفات **نفسیہ** تصوف میں ہے، نام سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس کے متعلق کوئی رسالہ ہے، مآثر رحیمی میں اُس کی نسبت لکھا ہے،

"و رسالہ نیز موسوم بہ نفسیہ در نثر نوشتہ کہ صوفیان و درویشان را سرلوحہ دفتر تصوف و تحقیق می تواند شد"

مثنوی بجواب مخزن اسرار، دیوان کے ساتھ چھپی ہے،

مثنوی بجواب شیرین خسرو، آتشکدہ اور مجمع الفصحا میں اس کے اشعار نقل کئے ہیں،

کلیات قصائد و غزلیات ۹۹۶ھ میں ایک دیوان ترتیب دیا تھا جسمیں ۲۶ قصیدے، ۲۷۰ غزلیں اور ۷۰۰ شعر کے قطعات و رباعیاں تھیں، اس دیوان کی خود ہی تاریخ کہی تھی،

ایں طرفہ نکات سحری و اعجازی	چوں گشت مکمل بہ رقم پردازی
مجموعہ طراز قدس تاریخش یافت	اول دیوان عرفی شیرازی

اس رُباعی میں عجیب و غریب صنعت رکھی ہے، چوتھا مصرع جس سے تاریخ نکلتی ہے اس میں اکائیوں کے عدد لئے جائیں تو قصائد کی تعداد کے موافق ہوتے ہیں یعنی ۲۶، دہائیوں کے عدد شمار کئے جائیں تو غزلوں کی تعداد کے برابر ہوتے ہیں یعنی ۲۷۰ اور سیکڑوں کو لیا جائے تو قطعات و رباعیوں کی تعداد ظاہر ہوتی ہے یعنی ۷۰۰، مختصر یہ کہ اسی مصرع میں تاریخ بھی ہے اور ہر قسم کے اشعار کی الگ الگ تعداد بھی،

یہ اخیر کا کلام ہے، اس سے پہلے چھ ہزار شعر کہے تھے، وہ بدقسمتی سے ضائع ہو گئے، چنانچہ اس کے ماتم میں ایک پر درد غزل لکھی[1] جو دیوان میں موجود اور ذیل میں درج ہے،

عمر در شعر بسر کردہ و در باختہ ام | عمر در باختہ را بار دگر باختہ ام

ساقیِ مصطبۂ نظم دمی ریختہ ام | طائرِ باغچۂ قدسم و پر باختہ ام

العطش می زند از تشنہ لبی ہر مویم | کہ قدح ہاے پُر از خونِ جگر باختہ ام

رصدِ شرعِ ہنر چون نہ شود محو کہ من | شش ہزار آیتِ احکامِ ہنر باختہ ام

اسی رنج و غم میں یا دفعتہً بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کے جوش میں آکر کہتا ہے، اور کیا خوب کہتا ہے:-

گفتہ گر شد ز کفم، شکر کہ ناگفتہ بجاست | از دو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام

اس خیال کو کہ اگر پچھلا کلام جاتا رہا تو مضائقہ نہیں پھر کہہ لونگا، کس لطیف شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا ہے یعنی، ''اگر کہا ہوا جاتا رہا تو پروا نہیں، شکر ہے کہ بن کہا ہوا تو موجود ہے''

مرنے کے وقت اپنا دیوان جو اُس کے ہاتھ کا مسودہ تھا عبدالرحیم خانخاناں کے کتبخانے میں بھیجدیا تھا کہ مدون کر دیا جائے، چنانچہ خانخاناں نے محمد قاسم مشہور بہ سراج کو اس کام پر مامور کیا، سال بھر کی شبانہ روز کی محنت میں دیوان کی ترتیب پوری ہوئی، کل چودہ ہزار شعر تھے، خانخاناں نے اس محنت کے صلے میں سراج کو انعام واکرام سے مالامال کر دیا، قاسم نے ایک قطعہ میں ان واقعات کا ذکر بھی کیا ہے،

عرفی آں واضعِ سخن کہ براد | رشک دارد روانِ شروانی

نہ کہ شروانی ست در رشکش | بلکہ ہم رودکی وصفاہانی

---

[1] مآثر رحیمی،

بعد چندے چو جاے بودن نیست	رفت ازیں دیر ششدر فانی
ماند ازو در شاہوارے چند	کش قریں نیست بحر یا کانی
صورتے چند جملہ با معنی	خلفے چند جملہ روحانی
لیک آں جملگی پراگندہ	ہمہ از بے سری و سامانی
آں قدر مہلتش نہ داد اجل	کہ بہ ترتیب شاں شود بانی
گفت بادوستاں بہ گاہ وداع	کاے عزیزان جسمی و جانی
برسانید زادہاے مرا	بہ جناب معلم ثانی
صاحب حلم و علم و سیف و قلم	خان خاناں سکندر ثانی
دیر چوں زادہاے عرفی ما	ہمہ مجموع و سعی پیکانی
بعد یک چند بندہ را فرمود	کہ دہم شاں نظام دیوانی
مدتے چند خون دل خوردم	تا کہ جمع آمد از پریشانی
از خرد خواستم چو تاریخش	گفت ترتیب دادہ نادانی

ترتیب دادہ سے ترتیب کی تاریخ نکلتی ہے، عبد الباقی نے اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا ہے، جس میں عرفی کے حالات اور واقعات درج کیے ہیں، چنانچہ مآثر رحیمی میں اسکا ذکر کیا ہے، افسوس یہ نسخہ آج بالکل نایاب ہے، ورنہ غالبًا بہت ہی دلچسپ باتیں معلوم ہوتیں صمصام الدولہ شہنواز خاں نے تذکرۂ بہارستان سخن میں لکھا ہے کہ عرفی کا ضائع شدہ کلام بھی آخر ہاتھ آیا اور دیوان میں داخل کر دیا گیا، لیکن جو نسخے اس سے پہلے شائع ہو چکے تھے، وہ ناقص رہے، یہ بیان قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، میں نے عرفی کے دیوان کے نسخے باہم مختلف دیکھے ہیں، مرزا صائب نے اپنی بیاض میں عرفی کے اکثر اشعار انتخاب

کئے ہیں جو موجودہ دیوانوں میں نہیں ملتے،

کلام پر رائے اس قدر مسلّم ہے کہ اصنافِ سخن میں سے عرفی مثنوی اچھی نہیں کہتا تھا، چنانچہ اس کے ایک معتقد خاص نے بھی تسلیم کیا،

مثنویش رنگ فصاحت نداشت　　　　کانِ نمک بود و ملاحت نداشت

اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کے کلام میں جا بجا خامی پائی جاتی ہے لیکن ان سب باتوں کے ساتھ وہ ایک طرز خاص کا موجد ہے، اور آج تک تمام شعراء اسکی تقلید کرتے آئے ہیں، مآثر رحیمی ہے :۔

"مخترع طرز تازہ ایست کہ الحال مستعدان و اہل زبان و سخن سنجان تتبع اومی نمایند"

ایک عجیب بات یہ کہ اسکی شاعری کی شہرت قصیدے میں ہے، لیکن وہ خود کہتا ہے،

قصیدہ کار ہوس پیشگاں بود عرفی　　　　تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل ست

عرفی کی نسبت معاصرین شعراء کی رائے میرزا صائب نے اس کا رتبہ نظیری سے کم قرار دیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں :۔

صائب چہ خیال ست شوی ہمچو نظیری　　　　عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

نظیری نے ایک ہم طرح قصیدے میں عرفی کے اشعار کا رد لکھا ہے، ہم ان کو اس موقع پر نقل کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوگا کہ نظیری جیسا شخص باوجود پوری کوشش کے عرفی کی شاعری پر اعتراض کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا،

دگر کہ گفت مبادا از ادای شعرم　　　　دریں قصیدہ بروز کمال بنشانی

ترا کہ فضل بحدے بود کہ در برہمت　　　　طیور وقت ترنم کنند سحبانی

کمال جہل و بلاہت بود کہ طعنہ زند　　　　بہ نقص مایہ کج فہمی و غلط خوانی

عرفی نے اپنے قصیدے میں کہا تھا کہ میرا قصیدہ کسی غلط خواں سے نہ پڑھوایا جائے،
ورنہ میرا بھی وہی حال ہوگا، جو کمالِ اسمعیل کا ہوا تھا، اس پر نظیری اعتراض کرتا ہے کہ
خانخاناں کی مجلس میں جانور بھی سحبان ہیں اس لئے یہ اندیشہ کرنا کمال حماقت ہے،

دگر نبود نہ شرط ادب درآوردن ‏ ‏ ‏ بہ سلکِ مدح تو مدحِ حکیم گیلانی

گر او بہ فضل فلاطون ست برکشیدہ نسبت ‏ ‏ ‏ بود بقرب کیاں اعتبار یونانی

اگرچہ سایہ ز رفعت زمین فروگیرد ‏ ‏ ‏ ولے نہد بہ پے آفتاب پیشانی

عرفی نے خانخاناں کے مدحیہ قصیدے میں حکیم ابو الفتح کی مدح بھی لکھی تھی، اس پر نظیری
اعتراض کرتا ہے کہ ابو الفتح کی آپ کے سامنے کیا حقیقت ہے، وہ آپ ہی کا ساختہ پرداختہ
ہے، اس لئے آپ کے ذکر کے ساتھ اس کا ذکر موزوں نہیں،

دگرچہ ابر درافشاں شود کسے کہ نہد ‏ ‏ ‏ کلاہ بادشہی را کلاہ بارانی

عرفی نے خانخاناں کی مدح میں لکھا تھا کہ ابو الفتح کے غصہ کا بادل جب برستا ہے تو لوگ
تیری محافظت کی بارانی ٹوپی ڈھونڈھتے ہیں، نظیری کا یہ اعتراض ہے کہ خانخاناں کے
بادشاہانہ تاج کو کلاہ بارانی نہیں کہنا چاہیے تھا،

اگرچہ کشورِ چیں پر نقش مانی بود ‏ ‏ ‏ خراب گشت نہ صورت بجاست نہ مانی

یہ شعر عرفی کے اس شعر کے جواب میں ہے ۔

ذخیرہ نہد از من کہ مانی از صورت ‏ ‏ ‏ تمتعے برم از وے کہ صورت از مانی

اعتراض یہ ہے کہ اب نہ مانی موجود ہے نہ اس کی بنائی ہوئی تصویریں، اس لئے عرفی نے
ممدوح کو مانی سے کیوں تشبیہ دی، ان اعتراضات کی جو وقعت ہے ناظرین خود اندازہ کرسکتے
ہیں، لطف یہ ہے کہ ان اعتراضات کے ساتھ نظیری نے خود اخیر میں عرفی کے تتبع کا قصید کیا ہے

چنانچہ کہتا ہے :-

بطرز وے ودوسہ بیتے دگراو اسازم | کہ بہر دعوی او قاطع ست برہانی

عرفی کے لئے یہ فخر کیا کم ہے کہ نظیری جیسا شخص اس کے تتبع کا قصد کرتا ہے،

نظیری کو عرفی کے کمال سے انکار ہے تو ہو لیکن ملک الشعرا فیضی اُس کی نسبت ایک خط میں لکھتا ہے :-

"از یاران دمساز و غمخواران ہمراز کہ دل از صحبت او آب می خورد، مولانا عرفی شیرازی ست کہ دریں نوروز بہ قدوم خود بر خاک نشینان ایں دیا منت نہادہ اند بحق دوستی کہ ازیں عظیم تر سوگندے نمی دانم کہ بہ بلندی و وفور قدرت، و ایجاد معانی و چاشنی الفاظ، و سرعت فکر و دقتِ نظر فقیر کسی را چون او ندیدہ و نشنیدہ، و از تہذیب اخلاق چہ گوید کہ درخاکی نہاد شیر از ذاتی می باشد نہ کسبی، چند بیت از ایشاں بہ عمل حاضر بود حاشیۂ ایں صحیفہ نوشتہ آمد"

بعد مردن بپرے باد بجائے خاکم | کہ فشانند مصیبت زدگان بر سر خویش

اے زلف عروس شادمانی شب تو | آرائش بزم بے غمی، مشرب تو

اپناشتہ ہجراں بہ نمک کہ دارد لم | امانہ از آن نمک کہ دارد لب تو

عشق آمد و رفت خوں چکاں در بازار | زہد آمد و کرد نقد تزویر نثار

آں پنبۂ داغ جست درین پنبۂ گوش | زاں حبل متیں تافتہ شد زیں زنار

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ عرفی کا کلام گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں کتب فروش بیچتے پھرتے ہیں اور "اہل عراق اور ہندوستانی تبرکاً لیتے ہیں" اس سے بڑھ کر حسنِ قبول کی کیا دلیل ہوگی۔

عرفی کلام

عرفی کی عمر ۳۶ برس سے زیادہ نہیں ہونے پائی، ابوالفضل کی دراندازی نے اس کو دربار میں کامیاب نہیں ہونے دیا، تمام ہمعصر شعراء اس سے ناراض تھے، اس کے کلام میں کثرت سے ناہمواریاں اور خامیاں ہیں، ان سب باتوں پر بھی اکبری دور میں جس قدر اس کا نام روشن ہوا کسی کا نہ ہو سکا، اور اب بھی اس کے قصائد تمام ہندوستان کے مکاتب میں داخل نصاب ہیں، اس سے خود بخود قیاس ہو سکتا ہے کہ اس کے کلام میں ایسے جوہر ہیں جن کی چمک کو کوئی چیز نہیں مٹا سکتی،

حقیقت یہ ہے کہ وہ طرز خاص کا موجد ہے، عبدالباقی جو خود اس کا معاصر ہے لکھتا ہے

"مخترع طرز تازہ ایست کہ احالی درمیانہ مستعدان و اہل زمان معروف است

و سخن سنجان تتبع او می نمایند"

اس کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :۔

زورکلام

۱۔ زور کلام جس کی ابتدا نظامی نے کی تھی، عرفی نے اس کو کمال کے درجہ تک پہنچا دیا، زور کلام ایک وجدانی چیز ہے جس کا اندازہ صرف مثالوں سے ہو سکتا ہے، مجملاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ الفاظ کی شان و شوکت، بندش کی چستی، فقروں کا دروبست، خیالات کی رفعت، مضامین کا زور، اس کے ضروری عناصر ہیں، عرفی کے کلام میں یہ تمام باتیں موجود ہیں، مثلاً،

آہنیں پنجۂ تیغش بہ اجل گفت کہ من | موج در موج شکستم چو بہ عماں رفتم

اگر نہیب دہد چرخ واژگوں گردد | دگر عتاب کند آفتاب خوں گردد

دوش بر دوش قضا دست در آغوش قدر | آمد از پردہ بروں، پردگی صنع خدائے

چمن آید بہ چمن بہر تماشائے جمال | بلبل آید بہ بلبل بہ تمنائے غزل

مرحبا اے نظر بخت تو کیواں پرور | مرحبا اے گہر ذات تو امکاں آرائے

ہر سر مویش اگر باز شگافی بخرد — سومناتیست کہ چیدست دو دولات ہبل

اس مضمون کو کہ ممدوح بڑے بڑے سلاطین کو شکست دیتا ہے اس انداز سے ادا کرتا ہے

رمحِ او گوید اگر جنگ دگر صلح کہ من — بہ کشادگرہِ جبہۂ خاقاں رفتم

یعنی اس کا نیزہ کہتا ہے کہ لڑائی ہو یا صلح، میں ہمیشہ خاقانِ چین کی پیشانی کے بل کھول دیا کرتا ہوں،

اس مضمون کو کہ میں معشوق پرستی کی وجہ سے ذلتیں اٹھاتا ہوں یوں ادا کرتا ہے،

ز الم ننگ نیم کہ بہ دنبالِ دلِ خویش مدام — در نشیبِ شکنِ زلفِ پریشاں رفتم

دشمن کے مرعوب ہونے کو اس طرح ظاہر کرتا ہے،

ز رعشہ باطنِ خصمت چو جعد حور وشاں — شکن بروئے شکن خم بروئے خم چنید

ممدوح کے جود و کرم، جاہ و جلال، حکومت و اقتدار کو یوں ادا کرتا ہے،

فارسِ حکمش بہ جولاں رفت و گفت — آفتابم گوست، چوگاں می زنم

یعنی اس کے حکم کا سوار میدان میں گیا اور بولا کہ آفتاب ایک گیند ہے، جس سے میں کھیل رہا ہوں،

گفت جاہش دہر بس تنگ شد — چاک در افلاک و ارکان می زنم

یعنی اس کے دبدبہ نے کہا کہ زمانے میں اب میں سما نہیں سکتا، اس لئے افلاک اور عناصر کو چاک کئے دیتا ہوں،

گفت جودش سیم و زر در کان نماند — سکہ بر پیشانیِ کان می زنم

یعنی اس کی سخاوت نے کہا کہ چاندی اور سونا کان میں نہیں رہا، اس لئے خود کان کی پیشانی پر سکہ لگاتا ہوں،

اس بات کو کہ اگر ممدوح کے خلافِ مزاج کوئی شخص بات کہے، تو فوراً واپس ہے گا یوں

ادا کرتا ہے۔

هر حدیثے کہ رضایت بسماعش نبود | از در گوش سراسیمہ بلب گردد باز

یعنی کہ جو بات کہ اس کے سامعہ کے خلافِ مرضی ہو، وہ کان تک آکر سخت بدحواسی

کے ساتھ بولنے والے کے ہونٹوں کی طرف پلٹ جائیگی۔

اس بات کو کہ حریف کس برتے پر میرا مقابلہ کر سکتا ہے، اس طرح ادا کرتا ہے،

خصم و طرزِ سخن من، بچہ فہم و بچہ درک | غیر و نظم گہر من، بچہ برگ و بچہ ساز

ممدوح کی تحریض اور نعرۂ جنگ سے بہادری کے عام اثر پیدا ہو جانے کو اس طرح

ادا کرتا ہے،

اگر بصحن چمن فی المثل شجاعت او | دہد نہیب کہ ہیں یاسمین و ہان نرگس

چو عکس لالہ زند یاسمیں در آب آتش (ق) | چو شاخ بید کشد، خنجر از میان نرگس

یعنی اگر اُس کی شجاعت باغ میں ڈپٹ کر چنبیلی اور نرگس سے کہے کہ ہاں لینا، تو چنبیلی

لالہ کے عکس کی طرح پانی میں آگ لگا دے گی، اور نرگس، بید کی شاخ کی طرح کمر سے

تلوار کھینچ لے گی،

نہیب، ہیں وہاں، آتش در آب زدن، خنجر از میان کشیدن، یہ الفاظ اور عکس لالہ

اور شاخ بید کی تشبیہ ان سب باتوں نے مل کر کلام میں کس قدر زور پیدا کر دیا ہے،

چونکہ اس کا کلام عموماً پر زور ہوتا ہے، اس لئے چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا، آگے اور

صورتوں کے ذیل میں جو اشعار آئیں گے اُن پر زورِ کلام کی حیثیت سے بھی نظر ڈالنی چاہئے،

۲- الفاظ کی نئی نئی ترکیبیں، عرفی نے سیکڑوں نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے استعمالے

پیدا کیے، جن سے جدت اور طرفگی کے علاوہ نفس مضمون پر خاص اثر پڑتا ہے، مثلاً

خیز و شراب جیر تم زاں قدِ جلوہ ساز دہ | روے بروے حسن کن ست بدستِ ناز دہ

مرہمی کن تو کہ فرزند مسیح است و مسیح | حاتمی کن تو کہ اقبال گدائی ست و گدائے

مرحبا اے زعنایاتِ ازل رمز فروش | مرحبا اے بہ علاماتِ ہنرِ خویش ستائے

ناخنِ قدرتِ او پردہ تحقیق تنگاف | خامۂ دولتِ او چہرۂ توفیق کشائے

گل اندیشۂ من، سحر غلط معجزہ رنگ | بلبل نطقِ من، الہام غلط، وحی سرائے

بہ برقعے مہ کنعاں کہ بود حسن آباد | بہ حجلہ گاہِ زلیخا کہ بود یوسف زار

بہ تیشۂ کہ براطراف صورتِ شیریں | ہمہ کرشمہ تراشید و ریخت بر کہسار

بہ بخل وعدہ تراش و قناعت عیاش

کہ گرشود، رہ کوی تو جلوہ نشتر خیز | کنم بہ مردمک دیدہ طیِ نشتر زار

بہ روش مہر فزاد بہ نگہ صبر گداز

یہ ترکیبیں جس قدر بدیع ہیں اسی قدر مضمون میں زور اور وسعت پیدا کرتی ہیں، فرض کرو اگر یہ کہنا چاہیں کہ مجلس میں کثرت سے خوش جمال جمع تھے تو یہ مضمون جس وسعت کیساتھ صرف اس لفظ سے ادا ہو سکتا ہے کہ "مجلس یوسف کدہ بن گئی تھی" سیکڑوں الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا،

اسی طرح نشتر خیز معجزہ رنگ، رمز فروش، کیواں پرور، امکان آراے حسن آباد، صبر گداز وغیرہ ترکیبوں سے مضمون میں جو زور، وسعت اور رنگینی پیدا ہوتی ہے، محتاجِ اظہار نہیں، اسی قسم کی ترکیبیں متوسطین اور متاخرین کی خاص ایجاد ہیں، عرفی اگر ان کی ایجاد کا خداے یکتا نہیں تاہم خدا ضرور ہے،

جدت استعارات و تشبیہ ۳- عرفی کے کلام کی خصوصیات میں سے ایک بڑی خصوصیت استعارات کی جدت اور طرفگی ہے، یہ مسلّم ہے کہ انشاپردازی اُسی قدر لطیف اور پُرزور ہوگی جس قدر استعارات لطیف اور پُرزور ہوں گے، عرفی نے استعارات کی جدت اور تنوع سے ایک گوناگوں عالم پیدا کر دیا، ان میں بعض بے مزہ اور دور از کار ہیں، جیسا کہ صاحبِ آتشکدہ اور مجمع الفصحا کا خیال ہے لیکن زیادہ تر ایسے ہیں، جو ایوانِ شاعری کے نقش و نگار ہیں، مثلاً

میرابوالفتح کز سیاستِ او	غمزۂ زہرہ خنجر اندازد
زان طفلِ اشک من ہمہ خوں شد کہ اوفتاد	دوش از دریچۂ دل و امشب زبامِ چشم
دلم چو رنگ زلیخا شکستہ در خلوت	غمم چو تہمتِ یوسف دریدہ در بازار
پرچمِ رُمحِ تو در آشوب گاہِ معرکہ	لیلۃ القدرے ست در ہنگامۂ یوم الحساب

ع بہ بر شگفتن امروز و غنچہ گشتن دی،

یعنی آج کا دن گویا ایک پھول ہے، جو کھل رہا ہے، اور کل کا دن کھل کر مرجھا گیا اور غنچہ بن گیا،

بہ خوی فشانیِ شبنم بہ خود فروشیِ گل	بہ نیزہ بازیِ سوسن بدشنہ سازیِ خار
ز نورِ ناصیہ ات ماہ گر ضیا گیرد	بہ آفتاب دہد نسخۂ سنین و شہور

ع چو صبح، بیضۂ خورشید پرورد بہ شکم،

ع کہ تا بیدن سر پنجۂ مرجاں رفتم
(پنجہ مروڑ نا)

بزم گاہِ تو حجلۂ یوسف	رزم گاہِ تو شانۂ ضحاک
دستِ مظلوم را چو کرد دراز	صد شبیخوں بہ شعلہ زد خاک
از خُمِ مدتِ تو جامِ نخست	جرعۂ دورِ آخرِ افلاک

یعنی تیری درازی عمر کی شراب کا پہلا جام، آسمان کا اخیر دور ہے،

حلۂ لفظ بر قد معنی
صدر وش دوختی و کردی چاک

آسمان دریوزہ کردو آفتابش کرد نام
لعلے از آویزۂ گوش شب یلدائے من

خوردہ ہر دم صد شکست از فوج قدر آشوب حسن
شوق بے ہنگام نازست بے پروائے من

مسلسل مضامین

۴۔ عرفی کا زور طبع اور فصاحت و بلاغت کا زور شور وہاں نظر آتا ہے جہاں وہ قصائد میں کوئی مسلسل مضمون ادا کرتا ہے، اور یہ اُس کا خاص انداز ہے، مثلاً خانخانان کے بیٹا پیدا ہونے پر جو قصیدہ لکھا ہے، اس کی تمہید اس طرح شروع کی ہے:-

بود در کتم عدم بکر طبیعت را جائے
کہ خرد بر سرش استادہ ہمی گفت برائے

چند در پردہ نشیند خلفِ دودۂ کون
محرمی نیست مگر ہم تو شوی پردہ کشائے

مریمی کن تو کہ فرزند مسیح ست و مسیح
حاتمی کن تو کہ توفیق گدائی ست و گدائے

ایں سخن گوش زدِ بکر طبیعت چوں گشت
خندہ زد گفت کہ رو صبر کن ِ ذِ اژ مجلسے

گوشہ گیر و جگر می خور و تلخی می کش
تا بعہدے کہ شود صاحبِ تو ملک آرائے

خلق از مژدہ بر د مژدہ شنو جمع شوند
ہمہ جوہر طلب و جوہری و گنج ستائے

فلک آمادہ شود زہرہ مہیا گردد
آں یکے حلہ طراز آید وایں غالیہ سائے

من بصد ناز کرشمہ ہمہ رنگ و ہمہ بوئے
بر سر حجلۂ ارکان (عناصر) نہم از خلوت پائے

پس درآید بہ برم آں کہ منش نام زدم (جس کے ہیں نامزد ہواں)
او گشد بند نقاب من و من بند قبائے

نعت کی تمہید اس طرح لکھتا ہے،

آمد آشفتہ بخوابم شبے آں مایۂ ناز
بہ روش جلوہ فزا و بہ نگہ صبر گداز

چہ پری چہرہ نگارے کہ ندارد مثلش
در پس پردۂ فطرت فلک لعبت باز

دیدم القصہ کہ خوش گرم عنان ست و روان
سودم اندر قدمش چہرہ بصد عجز و نیاز

گفتم اے عربدہ جو چیست گناہم؟ کہ دگر
بہ تعرض ہمہ خشمی، بہ تغافل ہمہ ناز

گفت ایں خود نہ گناہ ست کہ ساکت شدہ
از ثنا گستری شاہ سرمد اعجاز

منفعل گشتم و فی الحال بہ ادای مدیح
مرکب طبع جہاندم بہ ہوای تگ و تاز

رہ نبردم بہ سر کشور معنی ہر چند
کہ دران بادیہ راندم بہ نشیب و بہ فراز

گریہ آلود فتادم دگر اندر قدمش
گفتم اے مایہ آرام دلِ اہلِ نیاز

از جبین چین بکشا تا دلِ من جمع شود
کہ سراسیمہ کند مرغِ خیالم پرواز

ایں سخن در دلش از درد اثر کرد و سرم
برگرفت از قدم خویش و بلطف آمد باز

بے حجابانہ زدم بوسہ بدستش از شوق
گفتم اکنون دہ اجازت کہ شوم حق طراز

جہانگیر نے شاہزادگی کے زمانہ میں عرفی کا شہرہ سُن کر دربار میں بُلایا، چونکہ عرفی جہانگیر کا عاشق تھا، ہمہ تن شوق اور بیتابی کے عالم میں گیا، جہانگیر نے نگاہِ لطف سے دیکھا، اور اشاروں میں باتیں کیں، پھر مسکرا کر قصیدے کی فرمائش کی، اس دلچسپ داستان کو قصیدۂ مدحیہ میں ادا کرتا ہے:-

صباح عید کہ در تکیہ گاہِ ناز و نعیم
گدا کلاہ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

جہان چنین خوش و من خوشتر انچنان بہ وثاق
نشستہ با خرد اندر تعلّم و تعلیم

کہ ناگہان ز درم در رسید مژدہ دہے
چنان کہ از چمن طالعم بہ مژدہ نسیم

چہ گفت؟ گفت کہ اے مخزنِ جواہرِ قدس
چہ گفت؟ گفت کہ اے مطلبِ بہشتِ نعیم

بیا کہ از گہرت یاد می کند دریا
بیا کہ تشنہ لبت را طلب کند تسنیم" (چشمہ بہشت کا)

از ایں پیام دلم (یعنی جہانگیر) شد شگفتہ و شاداب
چنانکہ باغ ز شبنم چنانکہ گل ز نسیم

بہ رہ فتادم و گشتم چناں شتاب زدہ	کہ دستِ اہلِ کرم در نثار گوہر و سیم
چو روزگار رسیدم بدرگہے کہ کند	زمانہ طوفِ حریمش بہ دیدہ تعظیم
رسیدنِ من و اقبالِ آں ہمایوں فال	چناں فتاد مطابق در آں خجستہ حریم
کہ گرداب نہ کشیدی عنانِ من قدمش	.بوسہ گاہ ہمی کرد بر لبم تقدیم

یعنی میرا وہاں پہونچ کر زمین بوسی کے لئے گرنا، اور شاہزادہ کا سامنے سے آنا اسقدر مطابق پڑا کہ اگر میں ادب سے رُک نہ جاتا تو بجائے اس کے کہ میرے لب اس کے قدم چومتے، اُس کے قدم میرے لب کو چوم لیتے،

مرا چو دوش بدوش ادب بدید استاد	بہ لطفِ خاص بدل کرد التفات عمیم
رموزِ کورنش و تسلیم را ادا کردم	بہ داب مردم دانا و بذلہ سنج ندیم
نگفت و من بشنودم ہر انچہ گفتن داشت	کہ در بیان نگہش کرد بر زباں تقدیم

یعنی اس نے کچھ نہیں کہا لیکن میں نے سن لیا، کیونکہ اظہار مطلب میں اس کی نگاہوں نے زبان سے پیش دستی کی مطلب یہ کہ پہلے اشاروں میں باتیں ہوئیں،

لبش چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت	فتاد سامعہ در موجِ کوثر و تسنیم

یعنی جب ہونٹوں کی باری آئی (یعنی اُس نے تقریر شروع کی) تو میرا سامعہ کوثر کی موجوں میں ڈوب گیا،

بخندہ گفت کہ در عذر ایں گناہِ بزرگ	کہ رفتہ نامِ تو بے حکمِ ما بہ ہفت اقلیم
ہمیں کہ رفتی ازیں آستاں نوشتہ بیا	گزیدہ نسخہ از زادہائے طبعِ سلیم

ابوالفتح کے دربار میں جب ملازمت کا تعلق کرنا چاہا ہے تو قصیدہ لکھ کر لے گیا ہے، اور عجیب لطیف پیرایہ میں اپنی ملازمت کی خواہش ظاہر کی ہے،

خدایگانہ! دارم حکایتے برلب
کہ چوں مدیح تو بنوا ندم بہ لب استاد

خیال بندگیت دوش نقش می بستم
ز روے کسب شرفت نے ز روے استعداد

کہ ناگہ از در اندیشہ خانہ، شاہد عقل
کہ شمع خلوت اسرار مبدء ہست و معاد

کرشمہ سنج و تبسم کناں در آمد و گفت
کہ عید بندگیِ صاحبت مبارک باد

من از تعجبِ ایں حرف و بکشا گفتم
کہ اے ز لطفِ کلامِ تو ملکِ دل آباد

نہ آسمانم و نے آفتاب و نے بہرام (عطارد)
کز یں مطایبہ (ظرافت) گردم ز سادہ لوحی شاد

تو ہم ز حرف تنک مایہ تر زباں نشوی
بگو کہ صورت ایں مژدہ از چہ معنی زاد؟

جواب داد کہ ایں مژدہ را دلیلے (مست) ہست
کہ دست فطرتم آں را انطباقِ حصر نہاد

ہمیں نفس او آب ہو ز قدسیاں جبریل
دریچۂ حرم قدس را بدیدہ کشاد

بسوی کاتب اعمال بانگ بر زد و گفت
کہ اے رقم کشِ کردارِ خوب و زشتِ عباد

بشوی نامۂ عرفی کہ ایزد متعال
ز بندگانِ خودش برگزید و کرد آزاد

اگر نہ بندگیِ صاحبت بہ فال آمد
سبب چہ بود کہ جبریل ایں ندا در داد

من از متانت برہاں بشرم غوطہ زدم
شکست بر رخِ اندیشہ زنگ استعداد

بخدمت آمدم اینک بگو چہ مصلحت است
بر آستانِ تو باید نشست؟ یا استاد

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے، ابوالفتح کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے مخدوم! کل میں آپکی نوکری اور ملازمت کا خیال دل میں پکا رہا تھا وہ بھی اس بنا پر نہیں کہ میں اس قابل ہوں بلکہ اس لئے کہ یہ میری عزت کا سبب ہے اسی حالت میں عقل نے مجھ سے آکر کہا کہ لو مبارک، تم سرکار میں ملازم ہو گئے، میں نے متعجب ہو کر کہا کہ میں آسمان اور عطارد کی طرح سادہ لوح نہیں کہ اس مذاق پر یقین کر لونگا، آخر اس کا کوئی ثبوت بھی؟ عقل نے کہا ابھی ابھی جبریل نے

حرم قدس کے دریچے کھولے اور کاتب اعمال کو حکم دیا کہ عرفی کا نامۂ اعمال دھو ڈالو کیونکہ خدا نے اس کو اپنے برگزیدہ بندوں میں داخل کر لیا ہے اس دلیل کی متانت سے شرمندہ ہو گیا، اور اب خدمت عالی میں حاضر ہوا ہوں، کیا ارشاد ہے؟ آستانۂ عالی پر بیٹھنے کی اجازت ہے یا مودب کھڑا رہوں۔

اس قسم کی اور بہت سی مثالیں اس کے کلام میں موجود ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک واقعہ کو کس ترتیب اور کس تسلسل اور شاعرانہ انداز سے ادا کر سکتا ہے۔

۵۔ قصائد میں شعرا کی مجال نہ تھی کہ بادشاہ کی مدح و ثنا کے سوا اپنا ذکر کر سکیں اور کبھی ایسا کرتے تھے تو صرف اپنی بیچارگی اور بیکسی کا اظہار کرتے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ حضور اور شعرا کی زیادہ قدر کرتے ہیں، حالانکہ میں اُن سے بڑھ کر ہوں، عرفی چونکہ بالطبع نہایت غیور اور خود دار تھا، اس لئے مجبوری اور ضرورت کی وجہ سے امرا اور سلاطین کی مدح کرتا تھا لیکن ساتھ ہی اپنے فضائل اور اوصاف بھی جی کھول کر بیان کرتا اور مزے لے لے کر کہتا تھا، شاید ہی کوئی ایسا قصیدہ ہو جس میں ایک دو شعر فخریہ نہ ہوں شہزادہ سلیم کی مدح میں خودستائی کا بالکل موقع نہ تھا تاہم کہتا ہے:۔

خدا یگانہ! اگو یم بہ مدح خویش دو بیت | کزاں نیار و پرہیز کرد طبع سلیم

(یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ کم سے کم دو شعر بھی اپنی مدح کے نہ کہوں اسکے بعد دو شعر فخریہ لکھے ہیں)

اہل ادب نے انواع شاعری میں فخریہ کو ایک خاص صنف قرار دیا ہے فارسی میں اس خاص صنف میں عرفی کا کوئی ہمسر نہیں عجیب عجیب نئے اسلوب سے فخریہ لکھتا ہے، اور اس جوش سے لکھتا ہے کہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے، ایک قصیدہ میں ممدوح کو خطاب کر کے کہتا ہے عرفی کا غرور اب حد سے بڑھ گیا، آپ کبھی اس کے شعروں کی تحسین نہ کیجئے، پھر اپنی تمام

خوبیوں کو عیب کے پیرایہ کے بہانہ سے ذکر کر جاتا ہے،

داد یک شعر ز عرفی بستاں کیں مغرور / کبر و نازش بہ اندازۂ قدر ست و محل

نیم تحسین مکن ار گوید صد بیت بلند / کہ دماغش شدہ از حسنِ طبیعت مختل

عرفی اگر سیکڑوں عمدہ شعر کہہ جائے تب بھی اس کی تعریف نہ کیجئے، کیونکہ اس کا دماغ حسن طبیعت کے غرور سے مختل ہو گیا ہے:

ہر سر موئیش اگر باز شگافی بخرد / سومناتے ست کہ چیدہ ست درو لات و ہبل

عرفی کا ایک ایک بال چیر کر دیکھا جائے تو ایک سومنات نظر آئیگا جسمیں بُت چنے ہیں،

بہر اصل و نسبِ خویش نویسد بیرون / ہر چہ خواہد ز نسب نامۂ اربابِ دول

عرفی تمام ارباب دول کے نسب نامے اپنے نسب میں ملا لیتا ہے:

گوہر آمای رموز ست و نہ دریا و نہ کان / حکمت آموزِ عقول ست و نہ علم و نہ عمل

نہ دریا ہے نہ کان، باوجود اس کے دعویٰ کرتا ہے کہ رازنہ کے موتی میرے خزانہ میں ہیں،

نہ علم ہے نہ عمل، باوجود اس کے عقولِ عشر کو حکمت سکھاتا ہے،

چہ بلا عیب تراشم کہ حسد گم بادا / مشنو عیب زر دہی از سیم دغل

میں کس بلا کا عیب جو ہوں، آپ خالص سونے کا عیب کھوٹی چاندی سے نہ سنیئے،

آنچہ ذراتِ معانی ست کہ بر شے جوشند / ہمہ خورشید شود گر بشناسند محل

مضامین کے ذرے جو اسکے دل میں چمکتے ہیں وہ اگر اپنا رتبہ پہچانیں تو سب آفتاب بن جائیں،

دارد از عزتِ اصل گہر و ذلتِ شعر / پائے در تحت ثری دست در آغوشِ زحل

یعنی خاندانی اعزاز اور شعر کی ذلت کی وجہ سے اس کے پاؤں تو تحت الثریٰ میں ہیں لیکن ہاتھ

زحل کی آغوش میں ہے۔

عزت او نہ شہیدی ست کہ حشرش باشد | ورنہ نخچیستمے از ستم مدح و غزل
اگر او نامزد ننگ شد از ذلت شعر | شعر از عزت او دینک برآید ز ذلل

یعنی عرفی تو شعر کی وجہ سے ذلیل ہوا لیکن فن شعر معزز ہو گیا،

اکبر کے دربار میں خودستائی کی کس کو جرأت ہوسکتی تھی تاہم کہتا ہے،

شہا! بہ بزم تو چوں ایں قصیدہ برخوانم | کہ ملک نظم ز فیضش گرفتہ است نظام
سزد بجایزہ با جیب پُر گہر گردوں | بدو شم افگند ایں جامۂ زمرد فام

عرفی نے قصائد میں جس قسم کی خودداری کے خیالات کی ابتدا کی تھی، اگر اس کی طرح عام خیالات کا میلان ہو گیا ہوتا تو شاید یہ صنف کسی اچھے کام کا مصرف بن جاتی،

مضمون آفرینی

۶- عرفی کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی کا دوست اور دشمن دونوں نے اقرار کر لیا ہے، اس میں مطلق شبہہ نہیں ہو سکتا کہ اُس کی قوتِ تخیل نہایت زبردست تھی لیکن اس زمانہ کا مذاق تھا کہ یہ قوت صرف مبالغہ، جدت تشبیہ اور حسنِ تعلیل وغیرہ پر صرف کی جاتی تھی، عرفی کا زور بھی انہی فضول چیزوں پر ضائع ہوا تاہم جو نمونے موجود ہیں ان سے یہ قطعی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر اس سے بجا طور پر کام لیا جاتا تو شاعری کی سرحد کہیں سے کہیں پہونچ جاتی، ہم چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں:-

آں کہ چوں در کنفِ چترِ ہمایوں آثار | ہم عنانِ ظفر از رہ غزا گردد باز
زہرہ گیسو بکشاید کہ شود گرد فشاں | از رکابش کہ پذیرفتہ غبار از تگ و تاز
فتح گوید چہ کنی چشم من است ایں رگ آں | سرمۂ چشم جہاں بین مرا پاک مساز

یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چتر کے سایہ میں میدان غزا سے واپس آتے ہیں تو زہرہ چوٹی کھول کر چاہتی ہے کہ رکابوں پر جو گرد پڑ گئی ہے اس کو جھاڑ دے، فتح کہتی ہے، اپنا

یہ کیا کرتی ہے؟ یہ رکاب تھوڑی ہی ہے یہ تو میری آنکھیں ہیں، اس کے سرمہ کو دگر دگو ہمرمہ قرار دیا ہے، کیوں چھڑاتی ہے،

احتساب تو اگر عارض نہی افروزد — ای سراپردۂ عصمت زتو با زینت ساز
زخمہ ہر چند کہ انگشت زند بر لب تار — نغمہ از بیم نیارد کہ بر آورد آواز

یعنی اگر آپ کا احتساب ظہور میں آئے تو مضراب گو کتنا ہی تار کو چھیڑے لیکن نغمہ کبھی ڈر کے مارے آواز اونچی نہ کر سکے،

ہر حدیثے کہ حکایت بتماشش بنود — از در گوش سراسیمہ بلب گردد باز

گھوڑے کی تعریف

لوحش اللہ زشبگیر سمند تو کہ ہست — دودہ مان کسل از شوخیِ او متاصل

(سبحان اللہ گھوڑا)

آں سبک سیر کہ گر گرم عنانش سازی — از ازل سوے ابد وز ابد آید بہ ازل
قطرہا کش دم رفتن چکد از پیشانی — شبنم آساش نشینند گہ رجعت بہ کفل

یعنی گھوڑا اس قدر تیز رفتار ہے کہ اگر تو اس کو دوڑائے تو ازل سے ابد اور ابد سے ازل تک کا چکر اتنی دیر میں لگا آئے گا کہ جاتے وقت اس کی پیشانی سے جو قطرے ٹپکیں گے وہ واپسی میں اس کے پٹھوں پر ٹپکیں گے اور زمین پر نہ گرنے پائیں گے،

طرز ادا کی جدت

عرفی جدتِ ادا کا گویا موجد ہے، اور اس کا ہر شعر جدت کی ایک نئی مثال ہے، جو اشعار اوپر گذر چکے ان میں بیسیوں مثالیں ملیں گی، اس لئے ہم صرف چند اشعار پر اکتفا کرتے ہیں،

ہولیم دوست شد ترسم کہ اسیتلائے عشق — یک انا الحق گوے دیگر بر سر دار آورد
اے برہمن چہ زنی طعنہ کہ در معبدِ ما — سبحہ نیست کہ آں غیرتِ زنار تو نیست
دردل شکنی آفتِ ہر ست نگاہش — طفلے کہ پدرہ می شکند طرفِ کلاہش

ساقی تو بیٔ و سادہ دلی بین کہ شیخ شہر — باور نمی کند کہ ملک می گسار شد

زخمہا برداشتیم و فتحہا کردیم لیک — ہرگز از خونِ کسے رنگیں نشد داماں ما

فارغ ز خیرگی نگرد روئے آفتاب — ایں دیدہ آزمودۂ نظارۂ کسیست

گوش معزول ست در خلوت گہ ارباب راز — دودِ شمعِ خلوتِ ایشاں بروزنِ دشمن ست

لباسِ صورت اگر واژگوں کنم بینند — کہ خرقۂ (موٹا) پشمینم مایۂ طلا بافست

ایما و اشارت نہ باندازۂ راز ست — ایں رشتہ بانگشت نہ پیچی کہ دراز ست

نسبت سبحہ و زنار دو صد رنگ آمیخت — ورنہ ایں رشتہ ہماں ست کہ آدم می رشت

عشق اگر غم داد و جانِ دل شدہ عیش مکن — بیع اول بود و آشوب خریدار نبود

زنند طعنہ بجنت بہشت جویاں را — کہ ایں گروہ رعایائے ہمت پستند

شہید مضطرب بے خاک شد مگر بہ ہمت — پئے نسیم براہِ تو گرد می خیزد

ہلاک جوہرِ شمشیرِ نازِ خود باشم — کہ تا از زخم جدا گشتہ زنگ می گیرد

مدار جلوہ دریغ از دلم کہ خرمنِ حسن — بخوشہ چینیِ آئینہ کم نمی گردد

دل نشد فرزانہ و عقل از فسوں دلگیر شد — بر جنوں افزود ہوش تا قابلِ زنجیر شد

فسانہا کہ بیازیچۂ روزگار سرود — کنوں بمسندِ جمشید و تاج کے بستند

کمند کوتہ و بازوئے سست و بام بلند — بمن حوالہ و نومیدیم گنہ گیرند

کلید میکدہ ہا را بمن دہید کہ من — نہ آں کسم کہ باندازہ مست می گردد

چہ مطاعت طلبی برہمناں را زاہد — تو ریا ورز کہ ایں طائفہ کارے دارند

بساطی کاندرو طرحِ دو عالم میتواں کردن — بدست آوردہ ام اندازہ دیرکار می باید

ہمت علوی

بطورِ مانہ گنجد رہِ بیع دیدار — دلے ایں راز با موسیٰ نگوئید

دہر مرد افگن بہ میدانم کند تکلیف من | ایں متاع افتادہ بر بالای بستر می خرم
ہر بہا پائی مجو از من کہ من ایں جنس را | غائبانہ می فروشم، در برابر می خرم

صدق دوستی

تمام بود بیک حرف گرم دما غافل | حکایتے کہ ہمہ نا تمام می گفتند
بہ آفتاب از اں ذرہ را در اندازند | کہ عذر مردم کامل بہ ناکسے نہ نہند

بلند ہمتی

مو بمویم رشتہ زنار شد و از ناکسے | در خرابات مغاں بدنام اسلامم ہنوز

عشقیہ شاعری

عرفی ایک طرف تو نکتہ سنج اور نکتہ شناس اور ذوقِ عرفان سے آشنا تھا، دوسری طرف شباب میں نہایت خوشرو اور حسین اور لوگوں کا منظور نظر رہ چکا تھا، ہندوستان میں آیا تو شہزادہ جہانگیر پر عاشق ہوا، ان اسباب کی بنا پر وہ عشق اور محبت کی ایک ایک ادا سے واقف تھا، وہ کہیں عشق حقیقی کے اسرار اور دقایق بیان کرتا ہے، اور کہیں مجازی عشق میں جو واردات اور معاملات پیش آتے ہیں، ان کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس عالم میں بھی وہ اپنے تمام ہمعصروں سے اس بات میں ممتاز ہے کہ وہ سطحی اور سرسری واردات نہیں بیان کرتا، بلکہ گہرے اور دقیق معاملات پر اسکی نظر پڑتی ہے، اور انہی کو شاعرانہ انداز میں ادا کرتا ہے،

شوقِ دیدار میں عاشق ہمہ تن نظارہ بنجاتا ہے، اس حالت کو یوں ادا کرتا ہے،

چگونہ مانعِ نظارہ ام شوی کہ مرا | ز شوقِ روے تو سر تا قدم نگہ خیزست

استیلاے عشق کی حالت میں ہر قسم کے عام جذبات بھی عشق ہی کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں مثلاً عشق کی حالت میں اگر کوئی دنیوی صدمہ بھی پیش آتا ہے تو وہی مزہ دیتا ہے جو عشقیہ صدمات سے حاصل ہوتا ہے، اس حالت کو ادا کرتا ہے،

در دلِ ما غمِ دنیا غمِ معشوق شود | بادہ گر خام بود پختہ کند شیشہ ما

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معشوقوں کے سامنے حبیب کوئی ان کا ناز بردار نہیں ہوتا تو آپ ہی آپ بگڑتے ہیں اور گویا خود اپنے آپ پر ناز افشانیاں کرتے ہیں، اس مخصوص اور مخفی حالت کو بیان کرتا ہے :۔

فتان زغمزۂ شوخی کہ وقت تنہائی　　بہانۂ بخود آغاز کردہ در جنگ ست

جوشِ حسن میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معشوق آئینہ دیکھ کر، خود اپنے آپ کو پیار کرنے لگتا ہے اس حالت کو دکھاتا ہے :۔

دہنِ خویش ببوسند و لبِ خویش بکند　　چوں در آئینہ بینید بتاں صورتِ خویش

معشوق لطف اور نوازش کے ذریعہ سے عاشق کا دل مسخر کر سکتے ہیں لیکن عموماً وہ ایسا نہیں کرتے، بلکہ ظلم پسندی کی وجہ سے اس کے بجائے ناز اور قہر و عتاب سے کام لیتے ہیں اس معاملہ کو عجیب لطف سے بیان کیا ہے،

بہ ملکِ ہستی من رو نہادہ سلطانی　　کہ ما بصلح دہیم او بجنگ می گیرد

یعنی ہمارے ہستی کے ملک پر ایسے بادشاہ نے چڑھائی کی ہے کہ ہم صلح سے دیتے ہیں لیکن وہ خواہ مخواہ لڑ کر لیتا ہے،

معشوق یوں تو ہر وقت جلوہ فروشی کیا کرتے ہیں، لیکن کوئی تقاضا کرے تو رُک جاتے ہیں، اور ترساتے ہیں، اس کیفیت کو ادا کرتا ہے،

حسن را از شیوہ ہا گاہے بود میلے بناز　　ورنہ موسیٰ بے طلب صد رہ تماشا کردہ بود

عاشق ہجر کے زمانہ میں معشوق کی ایک ایک بات اور خصوصاً اُسکی معشوقانہ نگاہوں کو حافظہ کے خزانے سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتا ہے، اور اُس سے مزے لیتا ہے یا اسکی حسرت کرتا ہے، اس واقعہ کو یوں بیان کرتا ہے :۔

ہر ساعتے کز نگاہش می خرّم در روز وصل　　　　می نشینم گوشۂ دا از خود مکرر می خرم

ابتدائے عشق میں ہمہ وقت جوش اور درد و گداز ہوتا ہے اُس کی تصویر کھینچتا ہے:۔

عشق می گویم و می گریم زار　　　　طفل نادانم و اوّل سبق ست

معشوق سے خواہش کرتا ہے کہ ستاتا ہے تو ہم کو ستا کہ ہم پہلے ہی سے زخمی ہیں، اور ہمارے ستانے میں تجھ کو اور خود ہم کو زیادہ مزہ آئے گا،

ہر گاہ کہ از لطف بہ کیں میل تو بیش ست　　　　اوّل نمکِ سینۂ ما پاش کہ ریش ست

یعنی چونکہ تمہارا میلان بہ نسبت لطف کے ظلم کی طرف زیادہ ہے اس لئے پہلے ہمارے سینہ پر نمک چھڑکو کہ وہ پہلے ہی سے زخمی ہے،

معشوق اگر ہمیشہ ظلم اور بے اعتنائی ہی کیا کرے، تو عاشق اس کا خوگر ہو کر ایک اطمینانی حالت پیدا کرلے لیکن مصیبت یہ ہوتی ہے کہ معشوق کبھی کبھی لطف اور نوازش کی بھی چاشنی چکھا دیتے ہیں، اس کے بعد سرد مہری اور زیادہ چرکے دیتی ہے، اس کیفیت کو ادا کرتا ہے،

ازاں بہ درد دگر ہر زماں گرفتارم　　　　کہ شیوہ ہائے ترا باہم آشنائی نیست

یعنی اس لئے ہر وقت میں ایک نئی مصیبت میں گرفتار رہتا ہوں کہ تیری ادائیں ایک دوسرے سے نہیں ملتیں،

شفائیؔ نے اس مضمون کو زیادہ صاف اور واضح کر دیا ہے، لیکن وہ ابہام کا مزہ جاتا رہا وہ کہتا ہے:۔

ایں جور دیگر ست کہ آزار عاشقاں　　　　چنداں نمی کند کہ بہ بیداد خو کنند

معشوق جب بلند پایہ ہوتا ہے اور وہاں تک رسائی ناممکن ہوتی ہے تو عاشق

اپنی پستی حالت کا اندازہ کرتا ہے اور اس وقت یہ رنج کم ہو جاتا ہے کہ دیدار سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا، عرفی اس حالت کو حسرت کے لہجہ میں دکھاتا ہے،

آہ از ان حوصلۂ تنگ کہ از ان حسنِ بلند | کہ دلم را گلہ از حسرتِ دیدار تو نیست
نہ باندازۂ بازوست کمندم ہیہات | ورنہ با گوشۂ بامیم سرِ دکارے ہست

معشوق کی عام دلفریبی کو یوں ظاہر کرتا ہے ؛ ۔

یا رب تو چہ دارد دلِ خلوتیان را | کان مغبچہ مست ست و درِ صومعہ باز ست

ناز کی بے اعتنائی کا مضمون کس خوبی سے پیدا کیا ہے،

طیفانِ ناز بین کہ جگر گوشۂ خلیلؑ (یعنی حضرت اسمٰعیل) | در زیرِ تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

بیگانوں کے ساتھ معشوق کی صحبت بدمزہ ہے،

میروی با غیر و می گوئی بیا عرفی تو ہم | لطف فرمودی برو کیں پا ز رفتار نیست

یعنی غیروں کے ساتھ جا رہے ہو اور کہتے ہو کہ عرفی تو بھی آ، آپ کی عنایت لیکن مجھ سے چلا نہیں جاتا،

عشق میں عقل اور سمجھ سے کام لینا نہیں چاہئے،

گفتگو ہائے حکیمانہ نیا لاید عشق | بگذارید کہ این نکتہ مسلّم باشد

حسن کی رونق عشق سے ہے اور عشق کی حسن سے،

این صفا عشق و محبت نہ ہم اندوختہ اند | این دو شمع ست کہ از یکدگر افروختہ اند

تھوڑا سا غم دل کی عالی ظرفی کے قابل نہیں اور زیادہ سما نہیں سکتا،

فریاد کہ غمہائے تو در سینۂ تنگم | اندک نبود لائق و بسیار نہ گنجد

اب ہم عرفی کے ہر قسم کے چند عشقیہ اشعار درج کرتے ہیں،

دہ کہ از دوختن ایں چاکِ گریباں رفتہ ست　　ایں شگافے ست کہ تا دامنِ ایماں رفتہ ست

رفت آں آفتِ جاں از بزم اے ہوش بیا　　تا بہ بینیم کہ چہ بابر سرِ ایماں رفتہ است

یعنی وہ آفتِ جاں چلا گیا، اے ہوش اب آ تاکہ دیکھوں کہ ایمان پر کیا گذری،

عرفی از دو جہاں می رمد الا در دوست　　ہمہ جا وحشی از آن ست کہ آرام ست اینجا

بحث در ردّ و قبول ہت ترسا بچہ است　　ورنہ از کفر زبونی نبود ایماں را

یعنی ایمان کفر سے کم رتبہ نہیں لیکن گفتگو یہ ہے کہ کافر بچہ اسکو قبول بھی کریگا یا نہیں،

ز وصلش یافتم ذوقے کہ نبود انتقام آں را　　کسے ہرگز چنیں داغے بدل ننہادہ ہجراں را

یعنی اس کے وصل میں میں نے وہ مزا پایا کہ اس کا کچھ جواب نہیں ہو سکتا کسی شخص نے ہجر کو اس طرح نہ جلایا ہوگا جس طرح میں نے جلایا ہے،

قبولِ خاطرِ معشوق شرطِ دیدار ست　　بحکمِ شوق تماشا مکن کہ بے ادبی ست

یعنی معشوق جس حد تک پسند کرے اسی حد تک نظارہ کرنا چاہیئے، اپنے شوق کے موافق نظارہ بازی کرنا بے ادبی میں داخل ہے،

عرفی! بہ حالِ نزع رسیدی و بہ شدی　　شرمت نیامد از دلِ امیدوار دوست

بہانہ جوی تو عرفی! بناز عادت کرد　　بآشتی مرد اکنوں کہ صلح ہم جنگ ست

ز شکوہ ہاے جفایت دو کون پُر شد لیک　　ہنوز رنگِ ادب بر رخِ سخن باقی ست

یعنی باوجود انتہاے شکایت کے پاسِ ادب نہیں گیا،

حسنش نیاز مند تماشا ز ناز نیست　　اما ز ذوقِ جلوہ خود بے نیاز نیست

دو عالم سوختن نیرنگِ عشق ست　　شہادت ابتداے جنگِ عشق ست

دماغ آشفتۂ دارم دل نام　　کہ سر تا پاے صلح و جنگِ عشق ست

آں چناں مست جمال ست کہ شب تا سحر می کشد جام و ز کیفیت مے آگہ نیست

بر دو اے عقل منہ منطق و حکمت در پیش کہ مرا نسخۂ غمہاے فلاں در پیش ست

ہاں رہِ عشق ست کہ رفتن ندارد باز گشت جرم را اینجا عقوبت ہست استغفار نیست

تا فرید ابلہاں را از متاع روی دوست آسماں پیش از تو یوسف را ببازار آورد

زبت نہ گوشۂ چشمے نہ چین ابروے بحیرتم کہ دل برہمن زکف چوں شد

چو برد پیام، قاصد کنم ایں خیال و گریم کہ برش حکایتے من بکجا رسیدہ باشد

تا چند بزنجیر خرد بستہ تواں بود بے مستی و آشوب جنوں چند تواں بود

ای اجل! جاں ندہند اہل وفا سعی مکن یا برد ا رخصت از آں غمزۂ خونخوار بیار

ای آنکہ نرفت ست عنانِ دلت از دست یک لحظہ تماشائی آں دست عناں باش

بشکنم ناقوس و تسبیح بدست آرم ولے چوں کنم با آں کہ زنار از میاں می ردیدم

میروی با غیر و می گوئی بیا عرفی تو ہم لطف فرمودی برو کیں پاے رفتار نیست

بیا اے عشق از رسوائی جہانم کن کہ یک چندے نصیحت ہاے بیدرداں شنیدن آرزو دارم

داغ برہمن بس کہ پیوستم نشاں از دل نماند پیش ازیں صد داغ بر دل داشتم اکنوں یکی ست

عالمے در جلوہ و عاشق نہ بیند غیر دوست گر ز مجنوں پرسی اندر کارواں محمل یکی ست

فلسفہ عرفی نے غزل میں جس قدر فلسفیانہ خیالات ادا کیے کسی شاعر نے ادا نہیں کیے، اسکے ساتھ یہ خصوصیت ہے کہ شاعرانہ طرز ادا ہاتھ سے نہیں جاتا۔ سنائی، ناصر خسرو وغیرہ نے بھی دقیق فلسفیانہ مسائل بیان کیے ہیں، لیکن وہ محض فلسفہ ہے جو نظم میں ادا کر دیا گیا ہے، شاعری نہیں، بخلاف اس کے عرفی اس انداز سے ان باتوں کو ادا کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص فلسفہ کی حیثیت سے اُس سے لطف نہ اُٹھائے تاہم شاعرانہ ذوق سے محروم نہ رہیگا

مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکے گا،

یہ سب کہتے آئے ہیں کہ حقائق اشیاء ہم کو معلوم نہیں، سقراط نے کہا تھا کہ "مجھکو صرف اسی قدر معلوم ہوا کہ کچھ معلوم نہیں ہوا" بعینہ اسی خیال کو فارابی ابن سینا وغیرہ نے اشعار میں ادا کیا، لیکن عرفی نے اس فلسفہ کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا، وہ کہتا ہے :۔

حد کنہ تو بہ ادراک نشاید دانست ۔۔۔ وین سخن نیز باندازۂ ادراکِ من است

خدا کی ذات اور صفات کی جو تفسیر تمام اہلِ مذاہب نے کی ہے خوب غور کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے ان ہی حالات، ان ہی اوصاف، انہی اخلاق کو جو اس نے انسانوں میں دیکھے ہیں، زیادہ وسیع، زیادہ پاک، زیادہ بلند فرض کرکے ایک ذات کا تصور باندھ لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر قوم میں خدا کے اوصاف کی نسبت مختلف خیال ہیں، اس بناء پر عرفی کہتا ہے :۔

فقیہاں دفترے را می پرستند ۔۔۔ حرم جویاں دری را می پرستند

برافگن پردہ تا معلوم گردد ۔۔۔ کہ یاران دیگرے رامی پرستند

یعنی خدا اگر اپنے چہرہ سے پردہ اٹھا دے تو لوگوں کو نظر آئیگا کہ ہم خدا کو نہیں بلکہ کسی اور چیز کو پوج رہے تھے، اسی مضمون کو ایک اور لطیف طریقہ سے ادا کیا ہے،

آناں کہ وصفِ حسنِ تو تفسیر می کنند ۔۔۔ خوابِ ندیدہ راہمہ تعبیر می کنند

حقایقِ اشیاء یا عقائدِ مذہبی کی نسبت یا تو انسان کو نہایت اعلیٰ درجہ کا فلسفی ہونا چاہیے کہ تمام راز اس پر منکشف ہو گئے ہوں، یا محض تقلید پر عمل کرنا چاہیے، بیچ کی جو حالت ہے یعنی نہ تقلید نہ اجتہاد کامل، یہ نہایت خطرہ کی حالت ہے اور افسوس ہے کہ تمام عالم اسی میں مبتلا ہے، عرفی کو تین سو برس پہلے یہ نکتہ معلوم ہو چکا تھا، چنانچہ کہتا ہے،

قدم بروں منہ از جہل یا فلاطوں شو | کہ درمیانہ گزینی سراب و تشنہ لبی ست

یعنی یا تو بالکل جاہل رہو یا فلاطوں بنو، ورنہ بیچ میں رہو گے تو سراب در تشنہ لب کا حال ہوگا،

عرفی اپنی وسیع المشربی سے عرفان اور ذوق کو اسلام یا کفر میں محدود نہیں سمجھتا، اسکے نزدیک ہر جگہ حقیقت کا پرتو نظر آتا ہے، اس خیال کو اوروں نے بھی ادا کیا تھا، لیکن عرفی نے ایک عجیب تشبیہ سے اس کو صاف دکھادیا،

عارف ہم از اسلام خراب ست ہم از کفر | پروانہ چراغِ حرم و دیر نداند

یہ ظاہر ہے کہ پروانہ صرف چراغ ڈھونڈھتا ہے، وہ خواہ حرم میں جلتا ہو یا بتخانہ میں بت شکنی پر لوگ ناز کرتے ہیں، لیکن ایک عارف کو نظر آتا ہے، کہ بت شکنوں میں بھی وہی تمام اخلاق موجود ہیں، جو بت پرستوں میں پائے جاتے ہیں، اس لئے ایسی بت شکنی سے کیا فائدہ، اس بنا پر عرفی کہتا ہے :-

رفتم بہ بت شکستن و ہنگام بازگشت | با برہمن گذاشتم از ننگ دینِ خویش

یعنی بت توڑنے تو گیا تھا لیکن جب واپس چلا تو اپنا دین برہمن ہی کے یہاں چھوڑ آیا،

عام مسلمان جس طرح کعبہ کے ساتھ پیش آتے ہیں، اس میں اور بت پرستی میں مشکل سے فرق کیا جا سکتا ہے، اس بنا پر فیضی نے کہا تھا،

آں کہ می کرد مرا منع پرستیدنِ بت | در حرم رفتہ، طوافِ در و دیوار چہ کرد

عرفی اس مضمون کو زیادہ لطیف پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

ساکنِ کعبہ کجا دولتِ دیدار کجا | ایں قدر ہست کہ در سایۂ دیوارے ہست

عالم میں جو کچھ نظر آتا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو سب راند ہے،

ہرکس نشناسندۂ رازست وگرنہ　　این ہا ہمہ رازست کہ مفہومِ عوامست

چو دل شناخت سررشتہ گشت معلومش　　کہ دم بدم بکف آوردہ ورہا کردست

انسان عالم اکبر ہے،

از کتابے کہ نقش خاتمہ ام　　لوحِ محفوظ نختین ورق ست

سالک کو طلب چاہیے تقاضا نہیں،

زبان بہ بند و نظر باز کن کہ منع کلیم　　کنایت از ادب آموزی تقاضائیست

آنکھیں کھولو، اور زبان بند کرو کیونکہ کلیم کو جو منع کیا تھا تو یہ بتانا تھا کہ ادب محوظ رکھنا چاہیے،

حصولِ معرفت کے لئے وہم اور شکوک کی جولانیاں مفید نہیں بلکہ سکون اور صبر درکار ہے،

چنداں کہ دست و پا زدم آشفتہ تر شدم　　ساکن شدم میانۂ دریا کنار شد

تہ رسی اور غور کی ترغیب،

خمیر مایۂ آسایش ست لائے شراب　　بگو کہ صاف کشاں جرعۂ زتہ گیرند

لوگ نیک و بد میں تیز نہیں کر سکتے،

چہ ظلمت ست کہ بینندگاں نمی دانند　　کہ شب چراغ ستانند یا شبہہ گیرند

کسی قوم کی ترقی کے یہ معنی ہیں کہ دوسری قوم نے تنزل کیا ہے،

زمانہ گلشنِ عیش کرا بہ یغما داد　　کہ گل بدامنِ ما دستہ دستہ می آید

چونکہ مذہب کا مقصد زیادہ تر جمہور عام کی ہدایت کرنا ہوتا ہے، اس لئے مذہبی دلائل اکثر فلسفیانہ نہیں ہوتے بلکہ خطابیات اور عام فہم ہوتے ہیں، جن لوگوں کی فطرت میں خدا نے مذہبی میلان رکھا ہے، ان کو انہی دلائل سے تشفی ہو جاتی ہے، لیکن جن کو مذہب کا درد نہیں ان کو فوراً نظر آجاتا ہے کہ یہ دلائل قطعی نہیں، بلکہ عام پسند ہیں، اس بنا پر ان لوگوں

کوتاہ ہوتا ہے کہ ہم کس قدر حقیقت شناس ہیں، عرفی کہتا ہے کہ یہ ناز کی بات نہیں بلکہ مذہبی بیدردی کی دلیل ہے، اس کو یوں ادا کرتا ہے،

دلت فریب گر از جلوۂ سراب نہ خورد	ز نقصِ تشنہ لبی داں بعقلِ خویش مناز

سراب اس ریتے کو کہتے ہیں جو دور سے پانی کی طرح نظر آتا ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ فرض کرو تمہارا گذر سراب پر ہوا، اور تم نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ سراب ہے، پانی نہیں تو تم اپنی عقل پر ناز نہ کرو، بلکہ یہ سمجھو کہ تم پیاسے نہ تھے، ورنہ اگر پیاس کا غلبہ ہوتا تو قطعاً سراب پانی نظر آتا، شراب کی تشبیہ شاعر نے علی سبیل التنزل دی ہے، ورنہ یہ ظاہر ہے کہ مذہبی دلائل سراب نہیں ہوتے،

عام لوگ سمجھ نہیں سکتے، ورنہ عرفا کنایوں میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں،

کہ حرفِ نازک و اصحاب پنبہ در گوش اند	مگو کہ نکتہ سرایانِ عشق خاموش اند

کفر اور دین، دونوں اپنی گرم بازاری کے لئے لوگوں کو لڑواتے ہیں،

در بد آموزیِ مصلحت اندیش ہم اند	کفر و دیں را ببر از یاد کہ این فتنہ گراں

تعلق، ہر قسم کا حجاب پیدا کرتا ہے،

صد ہزاراں پردہ پیش پردۂ حائل یکی ست	گر تعلق نیست اسباب جہاں دو دو یکی

اخلاق | عرفی نے اخلاق کے اکثر مسائل بیان کئے ہیں لیکن وہ صرف ان اخلاقی اوصاف کو لیتا ہے، جو عزت نفس اور علو حوصلہ سے تعلق رکھتے ہیں، یہاں تک کہ اگر یہ اوصاف غرور و نخوت کی حد تک بھی پہنچ جائیں تو اس کے نزدیک اُن اوصاف سے بہتر ہیں، جن کی سرحد پست ہمتی سے مل جاتی ہے مثلاً تواضع، انکسار، فروتنی، توکل، قناعت وغیرہ اس بناء پر کہتا ہے ؎

کفرانِ نعمت گلہ مندانِ بے ادب ... درکیشِ من زشکر گدایانہ بہتر ست

وہ اعمالِ نیک کی تعلیم دیتا ہے لیکن اس لئے نہیں کہ دوزخ سے بچنے کا ذریعہ ہیں بلکہ اس لئے کہ گنہگار نادم ہوتا ہے، اور بسا اوقات ندامت نجات کا باعث ہو جاتی ہے اس لئے وہ مفت خواری کی نجات کو عالی حوصلگی کے خلاف سمجھتا ہے،

بضاعتے بکف آور کہ ہمت، فردا ... بجوے فشانی پیشانی حیا بخشند

یعنی عمل کا سرمایہ جمع کرو، ایسا نہ ہو کہ تم کو قیامت میں اس لئے بخشدیں کہ تمہاری پیشانی سے ندامت کا پسینہ ٹپکا تھا،

اس سے زیادہ صاف اور واضح کہتا ہے،

گرفتم آں کہ بہشتم دہند بے طاعت ... قبول کردن و رفتن نہ شرط انصاف ست

یعنی یہ مان لیا کہ مجھ کو بہشت بغیر عمل کے مل جائیگی لیکن اس کو قبول کرنا انصاف کے خلاف ہے،

وہ عالی حوصلگی کا یہ نمونہ پیش کرتا ہے کہ مخالف اگر ہماری غلطی کو صحیح سمجھے تاہم ہم کو مطمئن نہیں ہونا چاہئیے،

رستم زمدعی بقبولِ غلط ولے ... درتابم از تشکنجۂ طبعِ سلیم خویش

وہ یہ سکھلاتا ہے کہ گفتگو اور مباحثہ کی معرکہ آرائیوں میں فتح حاصل کرو لیکن اس طرح کہ فریقِ مقابل کا دل نہ دکھنے پائے،

زخمہا برداشتیم و فتحہا کردیم لیک ، ... ہرگز از خونِ کسے رنگین نشد دامانِ ما

وہ تجرد، صحرا نوردی، ترکِ لباس کو ریا کا شائبہ بتاتا ہے،

مرد بادیہ گردی کہ زرق و شیدائی ست ... برہنگی مطلب کان لباسِ رعنائی ست

وہ سکھاتا ہے کہ اپنے آپ کو عزیز الوجود نہ سمجھو، دنیا کا کارخانہ تم پر بند نہیں،

گماں مبر کہ تو چوں بگذری جہاں بگذشت ‌ ‌ ‌ ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی ست

وہ بتاتا ہے کہ اگر اپنا عیب دیکھنا چاہو تو اپنے آپ کو خود اپنا دشمن و منافق دشمن بنا کر دیکھو

خواہی کہ عیب ہاے تو روشن شود ترا ‌ ‌ ‌ یک دم منافقانہ نشیں در کمین خویش

منافق اس کو کہتے ہیں جس کے دل میں مخالفت ہو اور زبان سے دوستی کا اظہار کرتا ہو، شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر اپنے عیب سے واقف ہونا چاہتے ہو تو اس کی ترکیب ہے کہ اپنے آپ کو ایک الگ شخص فرض کرو، اور اس سے بظاہر دوستی کا اظہار کرو چونکہ انسان اپنے دوست سے کسی بات کا پردہ نہیں رکھتا، اس لئے وہ شخص اپنے تمام راز تمھارے سامنے کھول کر رکھدیگا، اس طرح تمام عیب ظاہر ہو جائیں گے،

وہ کہتا ہے کہ اگر ایک مسلمان کے روحانی اخلاق ایک کافر کے اخلاق سے بالاتر نہیں تو اُس کے اسلام کو کفر پر کوئی ترجیح نہیں،

رفتم بہ بتشکستن ہنگام بازگشت ‌ ‌ ‌ با برہمن گذاشتم از شرم دینِ خویش

اُس نے نہایت عمدہ تشبیہ سے اس بات کو علانیہ دکھایا ہے کہ جو لوگ خود آلودہ ہیں ان کی نصیحت کچھ اثر نہیں کرسکتی،

وعظِ من گرد فشانندہ عصیاں نشود ‌ ‌ ‌ آستینِ شکر آلود مگس راں نشود

وہ کہتا ہے کہ ریاکاری اس قدر عام ہوگئی ہے کہ کھلے ڈلے رندوں پر بھی اعتماد نہیں رہا،

از صدقِ اہلِ بت کدہ ہم اعتماد رفت ‌ ‌ ‌ از بس کہ اہلِ صومعہ تزویر می کنند

زاہد اور برہمن میں اُس کے نزدیک جو فرق ہے یہ ہے،

کافر ترست زاہد از برہمن، ولیکن ‌ ‌ ‌ اور ایست در بسر، و دم آستیں ندارد

یعنی زاہد برہمن سے زیادہ کافر ہے، فرق یہ ہے کہ زاہد کے ہاتھ میں بت نہیں ہے
بلکہ سر میں ہے،

آزادی اور خود مختاری کا وہ اس قدر شیفتہ ہے کہ اگر کوئی شخص نام کو بھی آزاد ہو تو
اس کے نزدیک رشک کے قابل ہے،

حسد تہمتِ آزادی سرو م بگداخت — کیں مرا دیست کہ بہ تہمتِ آں ہم حسد ست

سرو کو شعرا آزاد باندھتے ہیں، عرفی کہتا ہے کہ گو یہ تہمت ہے لیکن میں اس پر بھی رشک
کرتا ہوں، کیونکہ آزادی وہ نعمت ہے کہ جھوٹوں بھی کوئی شخص آزاد کہلائے تو رشک
کے قابل ہے،

وہ سکھاتا ہے کہ اصلی لذت اور آرام، روحانی لذت اور آرام ہے، اور یہ حاصل ہو
تو ظاہری تکلیفات سے مطلقاً متاثر نہیں ہونا چاہیئے،

معشوق در میانہ جاں مدعی کجاست — گل از دماغ می دمد آسیب خار چیست

وہ ہر بات میں میانہ روی اور اعتدال کی تعلیم دیتا ہے، اور اس مضمون کو اس لطیف
پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

مرا دو خضر عناں گیر باید از چپ و راست — کہ کج روی نہ کنم ور نہ عزم راہِ خطا ست

امامِ شہر ز سر جوشِ خُم نہ پرہیزد — نزاع بر سرِ تہ شیشہ ہای ناصاف ست

یعنی مال حرام، اگر بھرپور ملے تو امامِ شہر کو دریغ نہ ہو، یہ جو انکار ہے اس لحاظ سے
ہے کہ اس کی مقدار تھوڑی سی ہے،

علوِ نفس، بلند ہمتی اور حوصلہ مندی کے خیالات، جو عموماً شاعری میں نہایت کم تھے،
عرفی نے کثرت سے ادا کئے، چونکہ خود نہایت غیور اور عالی حوصلہ تھا، اس لئے وہ عادات

اور اخلاق جو بظاہر علو نفس کے خلاف نہ تھے لیکن در اصل ان کی بنیاد دنارت پر تھی، انکی نہ تک اُس کی نگاہ پہنچتی تھی، مثلاً تمام ایشیا میں حاتم کی فیاضی اور سخاوت کے چرچے پھیلے ہوئے ہیں، اور تمام لوگ اُسکی فیاضی کے افسانوں کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں، یہ امر بظاہر کوئی بری بات نہیں، بلکہ سچی قدر دانی کی دلیل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ایشیا میں اکثر مفت خواری کا طریقہ جاری رہا، یعنی لوگ سلاطین اور امرا سے مفت کے صلے اور انعامات حاصل کرتے تھے اس لئے اس قسم کی فیاضیوں کی نہایت مدح سرائی کرتے تھے، عرفی نے دیکھا کہ اس قدر دانی کی تہ میں اس مفت خواری کا اثر ہے، اس لئے کہتا ہے،

بیا بہ ملک قناعت کہ در دسر نہ کشی ‌‌‌‌ ‌‌‌‌ ز قصہ ہا کہ بہت فروش طے بستیند

یعنی اگر قناعت اختیار کر لو تو تم کو ان کہانیوں میں کچھ مزہ نہ آئیگا جو حاتم طائی کی طرف منسوب ہیں،

اس سے زیادہ صاف کہتا ہے،

کفرانِ نعمت گانہ سندان بے آنکہ ‌‌‌‌ ‌‌‌‌ درکیشِ من زشکر گدایانہ بہتر ست

یعنی میں کفرانِ نعمت کو بھی گدایانہ شکر گذاری سے زیادہ پسند کرتا ہوں،

زمانہ کے ہاتھ سے مجبور ہو کر معمولی چیز کی خواہش کرتا ہے، اس پر خود اس کو افسوس آتا ہے اور کہتا ہے،

کشادم دام بہ کنجشک و شادم یاد آں ہمت ‌‌‌‌ ‌‌‌‌ کہ گر سیمرغ می آمد بدام، آزاد می کردم

یعنی اب تو میں کنجشک پر جال ڈالتا ہوں اور اسی پر راضی ہوں لیکن ایک وہ بھی وقت تھا کہ سیمرغ جال میں پھنستا ہے اور میں نے چھوڑ دیا ہے،

بساطے کاندر و طرح دو عالم می تواں کردن ‌‌‌‌ ‌‌‌‌ بدست آوردہ ام اندازۂ دیر کاری باید

گر فتم آں کہ بہشتم دہند بے طاعت — قبول کردن و رفتن نہ شرط انصاف ست

وقت عرفی خوش کہ نکشودند اگر در بر رخش — بر در نکشودہ ساکن شد در دیگر نہ زد

عاشقانہ جذبات اور خیالات میں بھی اس کی عالی حوصلگی نہیں جاتی،

من ازیں درد گرانبار چہ لذت یابم — کہ بہ اندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

یعنی اس غم سے مجھ کو کیا لذت مل سکتی ہے جبکہ اسی کے برابر مجھکو صبر و استقلال بھی عنایت ہوا ہے،

تذکرہ سرخوش میں لکھا ہے کہ "ناصر علی اس شعر کو بہت پسند کرتا تھا" اگر یہ صحیح ہے تو ناصر علی کی اس بد مذاقی کا کفارہ ہوگیا جو اُس نے نظامی اور ظہوری کے موازنہ میں ظاہر کی تھی،

بادہ خواہی باش تا از خون دل بیرون دہم — آنکہ در جام و سبو دارم مہیا آتش ست

ہم سمندر[1] باش وہم ماہی کہ در جیحون عشق — روی دریا سلسبیل و قعر دریا آتش ست

عشق اگر مرد ست مردے تا بپیدا آورد — ورنہ چوں موسیٰ بسے آورد و بسیار آورد

مدہ عنان تعلق بجسن ہر ذرہ — برآر دستے و بر دوش آفتاب انداز

نہ بزم آسمان و یکے ذرہ در سماع — داں ہم بجام دل نفشاند آستین خویش

یعنی آسمان کی نو مجلسوں میں ایک ذرہ (انسان) وجد کر رہا تھا لیکن ان مجلسوں کی مجموعی فضا میں بھی یہ وسعت نہ تھی کہ وہ ذرہ ہاتھ پھیلا کر ناچ سکتا،

---

[1] عوام کے اعتقاد میں ایک کیڑا ہے جو آگ میں پیدا ہوتا ہے اور آگ ہی میں زندہ رہتا ہے۔

نظیری نیشاپوری

محمد حسین نام نظیری تخلص، اور نیشا پور وطن تھا، شاعری کا ابتدا سے شوق تھا اور ابتدائے مشق ہی سے شہرت ہو چلی تھی، خراسان میں جب اس کی شاعری مسلم ہو چکی تو کاشان میں آیا، یہاں حاتم، فہمی، مقصود خردہ، شجاع، رضائی شاعری میں استاد تسلیم کئے جاتے تھے، اُن کے مشاعروں میں جو طرحیں ہوتی تھیں نظیری بھی اُن میں طبع آزمائی کرتا تھا، اسی زمانہ میں ایک قدیم غزل طرح ہوئی، جائے تو باشد، ایمائے تو باشد، نظیری نے غزل لکھی،

فلک مزدور ایمائے تو باشد نوا زدھر کرائے تو باشد

"جائے" کا قافیہ استادوں کی غزل میں اس پہلو سے بندھ چکا تھا کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا تھا مثلاً :-

دو عالم را بیک بار از دلِ تنگ برون کردیم تا جائے تو باشد

نظیری نے اس پامال قافیہ کو بالکل نئے پہلو سے باندھا،

نیازارم زخود ہرگز دلے را کہ می ترسم درو جائے تو باشد

اسی قافیہ میں ایک اور اُستاد کا شعر یاد آیا،

جہانے مختصر خواہم کہ در وے ہمیں جائے من وجائے تو باشد

اس زمانہ میں عبد الرحیم خانخاناں کی فیاضی کا شہرہ دور دور پھیل چکا تھا، نظیری نے

لہ شعرائے مذکور کا مشاعرہ اور غزل کا یہ شعر مآثر رحیمی میں نقل کیا ہے،

نے اس کے دربار کا قصد کیا، اور آگرہ مین خانخانان سے ملا، چنانچہ جو قصیدہ اس موقع پر لکھا او

جو دیوان مین موجود ہے، اُس کا عنوان یہ لکھا ہے،

"این قصیدہ در مدح صاحبیم ابوالفتح بہادر عبدالرحیم خانخانان بن بیرم خان ہنگامے

کہ بایلغار از گجرات بدار السلطنت آگرہ آمدہ بودند و اول مداحی و ملازمت این جا کرد

بود گفتہ شد"

غالبًا یہ سنہ ۹۹۲ ہجری ہوگا، کیونکہ اسی سنہ مین خانخانان گجرات سے آگرہ گیا ہے،

اور مظفر گجراتی کے شکست دینے کے صلہ مین، اس کو خانخانان کا خطاب ملا ہے،

غالبًا خانخانان ہی کی تقریب کرنے سے اکبر کے دربار تک رسائی ہوئی، اوّل اوّل جب

وہ دربار مین پہنچا ہے تو جہانگیر کے بیٹا پیدا ہونے کا جشن تھا، نظیری نے جو قصیدہ اس موقع

پر پیش کیا ہے، اس کے عنوان مین صرف اسی قدر لکھا ہے، نام کی تصریح نہین کی، قرائن

سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خسرو کی ولادت کا جشن ہوگا جو سنہ ۹۹۶ ہجری مین پیدا ہوا تھا،

اس قصیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نظیری کے بہت سے حاسد پیدا ہوگئے تھے، جو اس کی

رسائی مین خلل انداز ہوتے تھے، چنانچہ خاتمہ مین کہتا ہے،

جماعتے ز سفیہان تیرہ طبع دنی	مدام در پیش افتادہ اند ہمچو دبال
ز بے تمیزی این ناقدانِ کم مایہ	گہر بقدر خزف گشتہ زر بسرخ سفال
سزد کہ اختر نظم مرا بیک ساعت	توجہ تو برون آرد از ہبوط وبال

اکبر کی مدح مین اس نے گاہ گاہ اور بھی قصیدے لکھے، اور غالبًا مقبول بھی ہوئے،

لیکن دربار مین اس کو کوئی خاص امتیاز نہین حاصل ہوا، اس لئے اس نے اپنا مستقل تعلق

خانخانان کے دربار سے قائم رکھا، اور احمد آباد گجرات مین سکونت اختیار کی، چند برس کے بعد

حج کا ارادہ کیا اور اس تقریب مین ایک قصیدہ لکھ کر خانخانان کی خدمت مین پیش کیا جس کا مطلع یہ ہے

زہیز خود نگنجم چو بہ خم مے مغانی | بدرد لباس بر تن چو بجوشدم معانی

اس مین شاعرانہ طریقے سے مصارفِ سفر کی درخواست کی،

ہمہ عیش این جہانی بعنایتِ تو دیدم | چہ عجب اگر بیابم ز تو زاد آنجہانی

خانخانان نے سفر کا سامان کر دیا، چنانچہ سورت سے جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ کو روانہ ہوا، راستہ مین بدوؤن نے لوٹ لیا، تاہم اس نے حج و زیارت دونون حاصل کی،

مآثر رحیمی مین نظیری کا سفر ۱۰۱۲ھ ہجری مین لکھا ہے، لیکن یہ سخت تعجب کی بات ہے نظیری کے دیوان مین ایک قصیدہ سلطان مراد (ابن اکبر شاہ) کی مدح مین ہے، اس کے عنوان مین خود نظیری لکھتا ہے،

"این قصیدہ نیز بعد از معاودت مکہ معظمہ بہ احمد آباد گجرات در مدح شاہزادہ ہمایوں نژاد شاہ مراد گفتہ شد"

یہ مسلم ہے کہ مراد ۱۰۰۸ھ ہجری مین مرا ہے، اس لئے نظیری کا سفر حج ۱۰۱۲ھ ہجری مین محال ہے، زیادہ تعجب اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مآثر رحیمی کا مصنف نظیری کا ہمعصر اور اسکا خواجہ تاش ہے، قیاس یہ ہے کہ نظیری نے ۱۰۰۲ھ ہجری مین حج کیا ہے، علاوہ اور قرائن کے ایک قرینہ یہ ہے کہ خان اعظم میرزا کوکہ (اکبر کا رضاعی بھائی) نے اسی سال مین حج سفر کیا تھا اور نظیری کے دیوان مین ایک قصیدہ خان اعظم کی مدح مین ہے، جس کا عنوان یہ ہے،

"این قصیدہ در راہ مکہ مکرمہ بعد از غارتِ سارقان و حرامیان تذیل بمدح نواب محمد عزیز اعظم خان منظوم شد"

۱؎ مآثر رحیمی،

اس قصیدہ مین اپنی حالت بیان کرکے درخواست کی ہے کہ میرے زادراہ کا سامان کردیا جائے،

بہ گوشۂ نظر التفات، محتاجم	بزوری کہ توان کشتنم بہ نیم نگاہ
زبے بضاعتی خوچنان ہراسانم	کہ بہر توشۂ رہ باز گردم از ارگاہ
بسیلِ مرحمت از خاکِ ذلتم بردار	کہ ہیچو غلبۂ عطشان فتادہ ام برِ راہ

حج سے واپس آکر اس نے مراد کے دربار مین رسائی حاصل کی، (اکبر نے شاہزادہ مراد کو دکن کی مہم پر بھیجا تھا، وہ ان اطراف مین فوجین لیے ہوے پڑا تھا)، نظیری چلتا پھرتا اس طرف جانکلا، دربار مین جانا چاہتا تھا کہ راہ مین ایک قدردانِ سخن کی نظر پڑ گئی اس نے بڑھ کر کہا کہ خوب موقع پر آئے، نوروز کا جشن ہے، قصیدہ لکھ کر پیش کیجیے، خود جاکر شاہزادہ سے تقریب کی، چوبدار آکر لوا گیا، دربار مین سجدہ بجا لانے کا دستور تھا، لیکن دربار کی شان وشوکت دیکھکر نظیری کے حواس جاتے رہے، اس لیے آداب اور آئین سب بھول گیا، نقیبون نے باز پرس کی تو جواب دیا کہ مین نے آج تک یہ شان وشوکت نہین دیکھی تھی اس لیے حواس ٹھکانے نہ رہے، یہ تمام واقعہ نظیری نے خود قصیدۂ مدحیہ مین لکھے ہین موقع کے خاص خاص اشعار ہم نقل کرتے ہین،

دران بساط کہ بیخود ہرا شعور بود	زدورِ دیدۂ دانادلے بمن افتاد
بمہر گفت کہ ای زیب بخشِ مجمعِ انس	بیا بیا کہ بوقت آمدی مبارکباد
بساطِ مجلس وآئینِ جشنِ فروردی ست	تو نیز جلوۂ آئین نظم خواہی داد
ہمین دو بید و بگفت و ہنوز پیدا بود	کہ شد عزیز کزین قطرہ کرد دریا یاد
چنان بپایۂ دولت شدم شتابزدہ	کہ چند بار سرم در مقام پا افتاد
زبس کہ تیز بآن بارگاہ در رفتم	ادب زپایۂ خود پائی بر فراز نہاد

زدلفریبی آئین دفتر سلطانی — بگاہ تہنیتم، رسم سجدہ رفت ازیاد

چو خوب رسم ادب را بجا نیاوردم — ندا رسید کہ اے روستاے مادر زاد

بساط عرش دیگر، ترا چہ پیش آمد — حریم کعبہ و غفلت ترا چہ حال فتاد

جواب دادم و گفتم بجرم معذورم — کہ تا منم بچنین دولتے نگشتم شاد

۱۰۱۴ھ ہجری میں اکبر نے وفات پائی اور جہانگیر تخت پر بیٹھا، وہ نہایت سخن شناس اور صاحب ذوق تھا، نظیری کا شہرہ سن کر دربار میں طلب کیا، چنانچہ ۵ سنہ تخت نشینی مطابق ۱۰۱۹ھ میں نظیری دربار میں حاضر ہوا اور انوری کے قصیدے پر قصیدہ لکھکر پیش کیا، جہانگیر خود تزک میں اس واقعہ کو لکھتا ہے،

"نظیری نیشاپوری کہ در فن شعر و شاعری از مردم قرار دادہ بود و گجرات بعنوان تجارت بسر می برد قبل ازین طلبیدہ بودم درین ولا آمدہ ملازمت کردہ قصیدۂ انوری را کہ

ع باز این چہ جوانی و جمال ست جہاں را

تتبع نمودہ قصیدہ بجست من گفتہ بود گذرانید ہزار روپیہ و اسپ و خلعت بصلہ این قصیدہ بدو مرحمت نمودم"

نظیری نے قصیدہ میں دربار کی رسائی کی پوری تفصیل لکھی ہی،

ناگاہ ندا آمد ز درم بانگ کہ گویند — فرمان طلب آمدہ از شاہ فلاں را

بے کفش و عمامہ بدر از خانہ دویدم — نے کردہ قبا در بر و نے بستہ میاں را

تا حاکم دیوان و بلد بر در سولم — دیدم ہمہ جا فترودہ دہان مژدہ رسان را

اصحاب جہاں مصحف از اصحاب شناسند — بگرفتم از احباب بہ تعظیم نشاں را

یعنی جس طرح لوگ قرآن شریف تعظیم سے لیتے ہیں اسی طرح میں نے بادشاہ کا خط تعظیم سے ہاتھوں میں لیا

بوسیدم و یر فرق بہ تسلیم نہادم | بکشادم و بر ناصیہ سودم رخ آن را
می دیدم و می سودم از ان سرمہ نظر را | برخواندم و لبیسیدم از ان شہید زبان را
فی الحال دویدم ز پے مرکب و سامان | کردم ز ہمہ روی دو داغ اہل مکان را
امروز سہ ماہ است کہ پویان سراغم | گلشن بہ دماغ و بہ بغل حاصل کان را
چون بحر تو در جزر و مد شیر شکاری | چون گنج روان من بطلب گنج روان را

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے فرمان طلبی کے بعد تین مہینے نظیری کو دوڑ دھوپ مین گذرے، جس کی وجہ یہ تھی کہ جہانگیر شکار مین مصروف تھا،

یہ وہ زمانہ ہے جب نظیری تارک الدنیا ہو چکا تھا، لیکن غلامی اور طمّاعی کی جو عادت راسخ ہو چکی تھی اس کا اقتضا یہ تھا کہ تین مہینے تک خاک چھانتا پھرا، اور شاہی فرمان کو قرآن شریف سے تشبیہ دی،

جہانگیر نے ایک دفعہ اس سے ایک عمارت کے کتابہ کی فرمایش کی، اُس نے یہ غزل لکھ کر پیش کی .

اے خاک درت صندل سر گشتہ سران را | باو اثرہ، چارہ سب رہ ہست، تاجوران را

جہانگیر نے اس کے صلہ مین تین ہزار بیگھہ زمین انعام مین دی[1]،

گلزار ابرار[2] مین لکھا ہے کہ نظیری نے مرنے سے بارہ برس پہلے ترک دنیا کر کے گوشہ نشین عزلت اختیار کیا، نظیری سنہ ۱۰۲۱ ہجری مین مرا ہے، اس لئے سنہ ۱۰۰۹ ہجری مین وہ گوشہ نشین ہوا ہو، دو تین قصیدون کے شان نزول مین اس نے خود بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، لیکن امرأ کی مداحی اس حالت مین بھی جاری تھی، چنانچہ یہ قصیدہ بھی اسی زمانہ کا ہے،

[1] سرو آزاد اور ید بیضا [2] نسخہ موجودہ کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی،

چندے بہ غلط بتکدہ کردیم حرم را　　وقت ست کہ از کعبہ بر آریم صنم را

اخیر مین اس کو علوم دینیہ کی تحصیل کا شوق ہوا، ۱۰۰۰ھ ہجری مین جب وہ خانخانان کے ہمرکابی مین دکن گیا ہے، تو راہ مین مندو سے گذرا، یہان شیخ غوثی مندوی سے ملاقات ہوئی، انیسی، شریف کاشی، کافی سبزواری، ملا بقائی وغیرہ بھی اس سفر مین ساتھ تھے، نظیری کو جب دینیات کا شوق ہوا تو ان ہی شیخ غوثی سے پہلے عربیت کی تحصیل کی، پھر مولانا حسین جوہری سے تفسیر اور حدیث پڑھی،[1]

۱۰۲۰ھ ہجری مین گجرات سے آگرہ مین آیا اور خانخانان کو اپنا دیوان حوالہ کرکے پھر گجرات واپس آیا،[2]

۱۰۲۳ھ ہجری مین بہ مقام احمدآباد گجرات وفات پائی، مکان کے قریب ایک مسجد بنوائی تھی، اسی مین دفن ہوا، یہ مآثر رحیمی کی روایت ہے، ورنہ تمام تذکرون مین سال وفات ۱۰۲۰ھ ہجری یا ۱۰۲۱ھ ہجری لکھا ہے،

نظیری کی قبر جس محلہ مین ہے اس کا نام تاجپورہ ہے، قبر پر ایک گنبد بھی ہے،

عام حالات اور اخلاق وعادات

نظیری نے اگرچہ بہت سے دربارون کی آستان بوسی کی لیکن اس کا اصلی تعلق خانخانان کے دربار سے تھا، خانخانان کو خان اعظم کوکہ (اکبر کا رضاعی بھائی) کی بہن بیاہی تھی، اس تعلق سے خان اعظم کی مداحی بھی کی ہے، اور باقی اکبر اور جہانگیر اور مراد تو حکمران وقت تھے، ان کی مداحی نہ کرتا تو کیا کرتا، معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ مراد سے اس کو دلی محبت تھی، شہزادۂ موصوف کا جو مرثیہ لکھا ہے، اس مین دلی جذبات نظر آتے ہین،

اے بزم تیرہ، رخ چون ارغوان کجاست　　وے رزم ادہمی، شہ گیتی ستان کجاست

[1] گلزار ابرار و خزانہ عامرہ تذکرۂ شبلی [2] مآثر رحیمی،

شوقِ سجود و حرمت تعظیم کمتر ست | آن نازِ صدر و سرکشیِ آستان کجاست
برگ و شگوفہ ریخت ثمر از کجا خورم | بشکست شاخ برگ مرا آشیاں کجا
کس را سرِ درو خورِ این تعزیت نبود | پیدا کنید کادلِ این داستان کجاست
خلقے بہ شیون اند، و نگویند حال چیست | صبر سخن شنیدن و تابِ بیان کجاست

آفاق در مصیبتِ او ممتحن شدہ
این مرگ باعثِ الم مرد و زن شدہ

غم خاست، در پیالہ می اند سا غرا فگنید | شد بزم تیرہ، پردہ از ان رخ برا فگنید
شمعے کہ دہر روشن ازو بود، مردہ است | پروانہ را بروِ نجا کسترا فگنید
در بزم او ز خلقہ، ماتم، خرام نیست | این حلقہ را ز صحنِ سرا بردرا فگنید
ریحانِ جلوہ، یاسمن عشوہ، ریختہ | چینید دہم بران قد جان پرورا فگنید
رفت آن سرے کہ تاج باد سر فراز بود | بر سر گنید خاک و کلاہ از سرا فگنید

خیزید تا بہ آن سر تابوت دم زنیم
عرضی کنیم و کار دو عشم بہم زنیم

خانخانان کے دربار مین جس قدر شعرا تھے، یعنی عرفی، شکیبی، انیسی وغیرہ سب سے معرکے رہتے تھے، ایک مرتبہ خانخانان نے انیسی کو ایک خط لکھا، جس کے حاشیہ پر نظیری کو بھی سلام لکھا تھا، نظیری کو نہایت ناگوار ہوا، ایک قصیدہ لکھا جس مین شکایت کا اس طرح اظہار کیا[1]،

تدسے ددسہ مخصوص دلِ ماتگ شدے | مخدوم، چنین یاد نہ کرد ست خدم

---

[1] ماثر رحیمی،

مانا مم خود از حاشیہ نشستیم گزین پیش | مہمان طفیلی نتوان بود قلم را

لاکھ روپیہ کا انعام | ایک دفعہ نظیری نے خانخانان سے کہا کہ لاکھ روپیے کا ڈھیر لگا یا جائے تو کس قدر ہوگا؟ مین نے کبھی نہین دیکھا، خانخانان نے لاکھ روپیے منگوا کر سامنے رکھوا دیئے، نظیری نے کہا خدا کا شکر ہے کہ آپ کی بدولت مین نے لاکھ روپیے تو دیکھ لئے، خانخانان نے روپیے اس کے گھر بھجوا دیئے،

تجارت وصنعت | نظیری کو زرگری مین کمال تھا، اس کے ساتھ تجارت بھی کرتا تھا، شاعری کی فتوحات الگ تھی، اس بنا پر امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا، اور امرا مین اس کا شمار ہوتا تھا[1] لیکن مزاج مین عرفی کی آن بان نہ تھی، اس لئے مرتے مرتے بھی مداحی کا شغل نہ چھوٹا،

مذہبی تعلیم | بخلاف اور شعرا کے مذہب مین سخت تھا، اکبر کے دربار مین جن آزادانہ خیالات کے چرچے رہتے تھے، ان سے بہت جلتا تھا، شاہزادہ مراد کی مدح مین جو قصیدہ لکھا ہے اس مین اس کا خاص ذکر کیا ہے، اور ابوالفضل یا مبارک کا نام بھی کنایۃً لیا ہے،

طبیعتِ ہمہ ابنائے دہر ملحد شد | ولے ز فطنتِ تو بر طرف فتاد الحاد

اگرچہ فضلۂ از فاضلانِ حاملِ دہر | بہ طمع جاہ و غنا کرد، مذہبے ایجاد

پس از حصولِ مراداتش، حالِ آن فاسد | مثل چو باغِ ارم گشت حسرتِ شداد

سفر حج جس ذوق وشوق سے کیا ہے، اس سے بھی اس کے مذہبی جوش کا اندازہ ہوتا ہو، جہانگیر اور شاہ عباس صفوی دونون نے تمباکو کے استعمال کو منع کرا دیا تھا[2] لیکن ع

چھٹتی نہین ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی

لوگ باز نہین آتے تھے، نظیری بھی اس کا جان دادہ تھا، چنانچہ تمباکو کی تعریف مین

---

[1] مآثر الامرا و تذکرۂ خانخانان وخزانہ عامرہ [2] مآثر رحیمی،

تمباکو کی تعریف

ایک غزل لکھی جو دیوان مین موجود ہے،

نے سنبلِ تنباکو ئے نہ آتشِ رخسارۂ | دل بوے خامے می دہد بے داغ آتش پارۂ

در نخل تنباکو نگر صوفی شدہ باز آمدہ | در کوے خود سرگشتۂ در شہر خود آوارۂ

چون بید مجنون ہر طرف افگندہ از سرطرۂ | چون دلق سالک ہر کجا افگندہ از بر پارۂ

پوری غزل تنباکو کی تعریف مین ہی،

اس زمانہ مین نظیر نام ایک شاعر تھا نظیری نے اس کو لکھا کہ اپنا تخلص بدل دو تاکہ دونون تخلصون مین اشتباہ نہ ہو، چونکہ نظیری دراصل نظیر سے ماخوذ ہے، صرف ایک حرف زائد ہے، اس لئے سرقہ کا الزام نظیری ہی پر عائد ہو سکتا تھا، نظیری نے دس ہزار روپیہ دیکر یہ حرف زاید (ی) خریدا، اور نظیر نے اپنا تخلص بدل دیا[۱]

شعرا مین سے خاص جن لوگون سے نظیری کے معرکے رہتے تھے، عرفی، ظہوری اور ملک قمی تھے، عرفی نے تو نظیری کو قابلِ خطاب نہین سمجھا، لیکن نظیری نے اس کے مرے پیچھے، قصیدہ مین اس کو گالیان سنائین، چنانچہ عرفی کے حال مین ہم نے وہ اشعار نقل کر دیئے ہین، ظہوری اور قمی نے ۱۰۲۰ھ ہجری مین نظیری کے پاس اپنے دیوان بھیجے، اور نظیری نے ایک ایک غزل کا جواب لکھا یہ اوحدی کا بیان ہے (ماخوذ از عرفات) لیکن اس مین کسی قدر مبالغہ معلوم ہوتا ہے، نظیری اس زمانہ کے دو ہی ایک سال کے بعد مرا ہے، اس لئے اتنے کم زمانہ مین ظہوری اور قمی کی ہزاروں غزلوں کا جواب کیون کر لکھ سکتا تھا،

نظیری کی خصوصیات

۱۔ تمدن جب ترقی کرتا ہے تو ہر چیز مین نئے نئے تکلفات پیدا ہوتے ہین، اور ان کے لئے جدت پسند صناع نئے نئے سامان پیدا کرتے ہین، یہ اثر جس طرح

---

[۱] سرو آزاد او ید بیضا،

مادی چیزون پر عمل کرتا ہے۔ غیر مادی اشیاء یعنی (خیالات) جذبات محبت، راز و نیاز، سوز و گداز سب چیزون پر عمل کرتا ہے، ابتداے تمدن مین معشوق کے صرف رنگ در وپ اور تناسب اعضا کا خیال آیا، اور اس کے لیے حسن ایک عام لفظ ایجاد کیا گیا، لیکن جب رنگین طبعی اور نکتہ سنجی زیادہ بڑھی تو معشوق کی ایک ایک ادا الگ الگ نظر آئی، اور وسعت زبان نے ان کے مقابلہ مین نئے نئے الفاظ مثلاً کرشمہ، غمزہ، ناز، ادا وغیرہ وغیرہ تراشے، اس قسم کے الفاظ اور ترکیبین جدت پسند طبیعتین ایجاد کرتی ہین، اور یہی طبیعتین ہین جن کو اس شریعت کا پیغمبر کہنا چاہیئے، ان الفاظ کی بدولت آیندہ نسلون کو سیکڑون، ہزارون خیالات اور جذبات کے ادا کرنے کا سامان ہاتھ آجاتا ہے، نظیری اس شریعت کا اولوالعزم پیغمبر ہے، اس نے سیکڑون نئے الفاظ اور سیکڑون نئی ترکیبین ایجاد کین، یہ الفاظ پہلے سے موجود تھے، لیکن جس موقع پر اس نے کام لیا، یا جس انداز سے ان کو برتا، شاید پہلے اس طرح برتے نہین گئے تھے مثلاً

ازکف نمی دہد دلِ آسان ربودہ را ‌‌‌‌ ‌ دیدیم زور بازوی ناآموزدہ را

آسان ربودہ کی ترکیب نئی ہے اور اس سے ایک وسیع خیال ادا ہو گیا، دوسرے مصرع مین زور، بازو، ناآموزدہ، سب مستعمل الفاظ ہین، لیکن ان سے نئی طرح سے کام لیا ہے کہنا یہ تھا کہ معشوق کم سن ہے اور اس کو کسی طرح کا تجربہ نہین تاہم جس شخص کا دل ایک دفعہ اس پر آجاتا ہے پھر اس کے پنجے سے چھوٹ نہین سکتا، اس مضمون کو یون ادا کرتا ہے کہ مین نے دیکھا کہ ایک ناآزمودہ بازو مین کس قدر زور ہے،

تامنفعل ز رنجشِ بیجا نہ سازمش ‌‌ ‌ می آرم اعتراف گناہ نبودہ را

چہ خوش ست از دو یکدل سرِ حرف باز کردن ‌ ‌ سخنِ گذشتہ گفتن گلہ، دراز کردن

اثرِ عتاب بردن ، ز دلِ ہم اندک اندک　　　　به بدیہہ آفریدن بہ بہانہ ساز کردن

شعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی لطف کا کیا موقع ہوتا ہے ، جب دو یک دل دوست آپس مین مل بیٹھتے ہین ، گفتگو چھیڑتے ہین ، پرانے تذکرے کرتے ہین ، شکایتین شروع ہوتی ہین ایک دوست روٹھا ہوا ہے ، دوسرا اس کو اس طرح آہستہ آہستہ منانا چاہتا ہے کہ جب وہ کوئی شکایت پیش کرتا ہے تو یہ جھٹ کوئی تاویل گڑھ لیتا ہے ، فوری تاویل کرنے کے لئے "بدیہہ آفریدن" کس قدر موزون لفظ ہے جو ایک بڑے خیال کو کس قدر مختصر لفظ مین ادا کر دیتا ہے زدلِ ہم ، اور اندک اندک کی ترکیب کس قدر واقعہ کی تصویر کھینچ دیتی ہے ،

نیست لذت نظر بازی بزمے کہ درو　　　　خندۂ زیر لب و گریۂ پنہانے نیست

یہ اُس حالت کی تصویر ہے کہ معشوق ، زیب مجلس ہے ، ہر طرح کے لوگ جمع ہین انھی مین عاشق غمزدہ بھی ہے ، وہ لوگون کی آنکھ بچا کر روتا ہے ، معشوق دیکھ رہا ہے اور مسکراتا ہے اس خیال کے ادا کرنے کیلئے ، خندۂ زیر لب اور گریۂ پنہان کسی قدر موزون ہین ،

چنان وقت شکایت از نگاہش مضطرب گشتم　　　　کہ مضمونِ سخن صد بار از دل تا زبان گم شد

کہنا یہ تھا کہ مین معشوق سے شکایت کر رہا تھا ، دفعۃً اس نے میری طرف نگاہ غضب سے دیکھا جس کی وجہ سے میرا یہ حال ہوا کہ سو سو دفعہ دل سے بات نکلتی تھی ، لیکن ہونٹون تک آآکے رہ جاتی تھی ،

شرم از میان برخاستہ ، عمر از وہان بلاو اشتہ　　　　گفتار بے پرسش یہ مین ، رفتار بے باکش نگر

شمارے تا سحر وستم بزلفِ درہمی وارد　　　　گر بیا تم گریبان ست و دامن ست امشب

شمار داشتن ، یعنی مصروف بودن ، مطلب یہ ہے کہ آج میرا ہاتھ زلف پریشان مین مصروف رہا (یعنی مین اسکو سلجھا یا کیا) اور مین اپنے گریبان اور دامن کو نہ پھاڑ سکا ، اس لئے آج

میرا گریبان گریبان ہے۔ اور دامن دامن ہے۔ یعنی دونون اصلی حالت پر ہین۔ گریبان اور دامن کے سلامت رہ جانے کو صرف ان دو لفظون کے تکرار لانے سے ادا کر دیا ہے۔ اور یہ کس قدر خوشنما طرز ادا ہے،

۲- وہ اکثر وجدانی باتون کو ایسے طریقہ سے ادا کرتا ہے کہ مجسم بن کر سامنے آجاتی ہین۔ اور اس سے عجیب خاص لطف پیدا ہوتا ہے، مثلاً یہ امر کہ معشوق کا ایک ایک عضو یا ایک ایک ادا دل ربا ہوتی ہے، یعنی ہر عضو اور ہر ادا کی طرف دل کھینچتا ہے۔ اس کو اس طرح ادا کرتا ہے،

زپائے تا بسرش ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اس شعر سے یہ تصویر پیش نظر ہوتی ہے کہ معشوق کا سراپا ایک مجلس ہے، جس مین بہت سے تماشائی جمع ہین۔ انھی مین دل بھی ہے، کرشمہ معشوق کے پیش خدمتون مین ہے۔ دل اس مجلس مین جب آجاتا ہے تو جدھر اس کا گذر ہوتا ہے، کرشمہ دامن پکڑ کر کھینچتا ہے کہ یہین بیٹھ جاؤ،

دو نیم گشتہ دل از کفر و دین نمی دانم　　کزین دو پارہ دل آید ترا بکار کدام

مقصد یہ تھا کہ دل مین کفر اور ایمان دونون قسم کے خیالات جمع ہین یا دونون طرف اس کا میلان ہے، معلوم نہین تجھ کو کیا پسند ہے۔ اس خیال کو اس صورت مین پیش نظر کرتا ہے کہ کفر اور اسلام نے دل کے دو ٹکڑے کر دیئے ہین، معلوم نہین کہ ان دونون ٹکڑون مین تیرے کام کا کون ہے،

کو زخم عاشقانہ کو در جلوہ گاہ حسن　　صد چاک دل بہ تار نگاہے رفو کنند

دلِ شکستہ دران کوے می کنند درست　　چنان کہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست

کہنا یہ تھا کہ معشوق کی گلی مین جانے سے رنج و غم اس طرح دور ہو جاتے ہین گویا کبھی

تھے ہی نہین، اس خیال کو یوں ادا کرتا ہے کہ دل گویا ایک شیشہ ہے، معشوق کی گلی مین شیشہ سازی کا کارخانہ ہے، وہان یہ شیشہ اس طرح جوڑ دیا جاتا ہو کہ یہ بھی نہین معلوم ہو سکتا کہ کہان سے لوٹا تھا،

دیدنش بر دیدنِ من حسرت دیگر فزود — خواستم پیکان برآرم از جگر نشتر شکست

می روم جائے کہ غم آنجا و لہا می رود — نالہ از ہر جا کہ بر می خیزد آنجا می رود

دل بردہ در دل باختن معشوق عاشق پیشہ بین — بگرفتہ در انداختن، ما زدے چالاکش نگر

شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کشی اور معشوق پر عاشق ہو گیا، لیکن معشوقی کی ادائین اب بھی قائم ہین، اس لئے ہین اس وقت جب کہ اس کا دل ہاتھ سے جاتا رہا، اس نے معشوق کو اپنا عاشق بنا لیا، اس مطلب کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے کہ گویا دو پہلوان لڑ رہے ہین، ایک پہلوان نے گرتے گرتے دانون کرکے حریف کو پچھاڑ لیا،

از یک حدیث لطف کہ آن ہم دروغ بود — امشب ز دفتر گلہ صد باب شستہ ایم

اور اک حالِ ما نگہ می توان نمود — لختے ز حالِ خویش بسیما نوشتہ ایم

من در پیِ رہائی داو از پے فریب — بر سر گرہ زند گرہ ناکشودہ را

کہنا یہ تھا کہ عشق چھوڑنا چاہتا ہون، لیکن معشوق لطف اور مہربانی کی ایسی لگا دٹین کرتا جاتا ہے کہ اور عشق بڑھتا جاتا ہے، اس مضمون کو یون مجسم کرکے دکھاتا ہے کہ ایک دھاگے مین گرہ پڑ گئی ہے، ایک شخص اس کو کھولنا چاہتا ہے، لیکن حریف ایسا تیز دست ہے کہ ابھی ایک گرہ کھلنے نہین پاتی کہ اور دوسری گرہ لگا دیتا ہے،

دیدہ ام دفترِ پیمانِ وفا حرف بحرف — نامِ خوبان ہمہ ثبت ست ہمین نام تو نیست

زبیدا و تو حرفِ مہر را نام و نشان گم شد — کتابِ حسن را جزو محبت از میان گم شد

نہ چنان گرفتہ جا بمیانِ جانِ شیرین — کہ توان ترا و جان را ز ہم امتیاز کردن

یعنی معشوق اور جان دو چیزیں ہیں جو اس طرح رل مل گئے ہیں کہ یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ جان کہاں ہے اور معشوق کہاں،

بہر نرخے کہ می گیرند کالائے وفا خوب ست　　پس از عمرے گذر افتاد بر ما کاروانے را

۳- اسی خصوصیت کے سلسلہ میں یہ بھی داخل ہے کہ نظیری اکثر حالات اور کیفیات کی تشبیہ مادیات اور محسوسات سے دیتا ہے، اور اس لئے اس سے ایک خاص استعجاب کا اثر پڑتا ہے، کیونکہ جب دو مخالف چیزوں میں تناسب اور تشابہ نظر آتا ہے، تو طبیعت میں استعجاب پیدا ہوتا ہے، اس قسم کے اشعار نظیری کے ہاں کثرت سے ہیں، مثلاً

شکوہ نقصان داشت فصلے از میان انداختم　　نرخ ارزان بود، کالا در دکان انداختم

یعنی میں معشوق کی شکایت کرتا تھا تو وہ ناراض ہوتا تھا، اس لیئے میں نے تقریر کا یہ حصہ حذف کر دیا، اس کو یوں تشبیہ دی، کہ چونکہ دام اچھے نہیں اٹھتے تھے، اس لیے میں نے سودا اٹھا کر دکان میں ڈال دیا،

بس غنچہ ناشگفتہ بتاراج خزان رفت　　رسم ست کہ رہزن زند از قافلہ پس را

حسن چندے سر بدل شوخی و رعنائی دہد　　شہ چو گیرد مملکت اول بہ یغمائی دہد

یعنی حسن ابتدا میں شوخی اور رعنائی سے زیادہ کام لیتا ہے، کیونکہ بادشاہ جب کوئی ملک فتح کرتا ہے تو پہلے لوٹنے والوں کے حوالہ کرتا ہے کہ لوٹ لیں، حسن بادشاہ ہے اور شوخی و رعنائی فوج کے ساتھ کے لٹیرے ہیں،

ز اظہار محبت بہ زبانِ لطف افتادہ ام　　چو محتاجے کہ گنجے یابد و ظاہر کند زودش

بوصلش تا ستم صد بار در خاک افگند شوقم　　کہ تو پنداری از شاخ بلندے آشیان دارم

آں دہد در گریہ پندم کہ با ما دشمن ست　　ہر کہ می گیرد تشنہ را بدریا دشمن ست

پیش ازو دارستگیہا، بیشتر گشتم گرفتارش — چو صیدے جست صیادش زدل سخت ترگیرد

یعنی ایک مرتبہ دل معشوق سے چھڑا کر پھر جو گرفتار ہوا تو سخت گرفتار ہوا، قاعدہ ہے کہ شکاری کے ہاتھ سے جب کوئی شکار چھوٹ جاتا ہے اور پھر ہاتھ آتا ہے، تو شکاری اس کو خوب مضبوط پکڑتا ہے کہ پھر چھوٹنے نہ پائے،

از شوقِ شہیدانِ حریم سر کویش — چون دانہ درآغوش نگنجند زمین را

ہمہ شب برلب و رخسار و گیسو می زنم بوسہ — گل و نسرین و سنبل را صبا در خرمن ست امشب

یعنی میں لب، رخسار، اور بالوں کو چومتا ہوں، گویا نسرین اور سنبل کے خرمن میں صبا گھس گئی ہے،

محبت ور دل غم دیدہ الفت بیشتر گیرد — چراغے را کہ دودے ہست در سر زود درگیرد

یعنی جو دل ایک مرتبہ عشق میں گرفتار ہو چکا ہے، بہت جلد عشق سے متاثر ہو جاتا ہے جس طرح وہ بجھا ہوا چراغ جس سے ابھی دھوان نکل رہا ہے، جلانے سے بہت جلد جل اٹھتا ہے،

ز بوالہوس گر دولت عاشق نمی گردد — طفیلی جمع شد چندان کہ جائے میہمان گم شد

یعنی ہوس پرستوں سے معشوق کو اس قدر انس ہے کہ عاشقون کو نہیں پوچھتا، طفیلی اتنے جمع ہو گئے ہیں کہ مہمان کی جگہ نہیں رہی،

بغیر دل ہمہ نقش و نگار بے معنی ست — ہمین ورق کہ سیہ گشتہ مدعا اینجا ست

یعنی گو سب کچھ ہو اگر دل صاف نہین تو کچھ نہین، گویا ایک کتاب میں بہت سے ورق تھے، لیکن جس ورق پر سیاہی گر گئی ہے اصلی مطلب وہین تھا،

تا کے چو موجِ آب بہر سو شنافتن — درعین بحر پاے چو گرداب بند کن

برنمی آید ہلال عید م از ابر امید — عمر رفت و ہمچو طفلان بر درد بامم ہنوز

دلم از نالہ خوش گردید، امید اثر باشد بسے آسودہ شستم[1] این قدر نگم کارگر باشد

شکاریون کا خیال ہے کہ جب تیر نشانہ پر لگتا ہے تو چٹکی کو آرام معلوم ہوتا ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ مین نے اب کی جو نالہ کیا اس سے میری طبیعت بہت محظوظ ہوئی، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ نالہ مین اثر ہوگا، جس طرح چٹکی کو جب لطف محسوس ہوتا ہے تو ضرور وہ تیر نشانہ پر لگتا ہے،

چو خانۂ سر کشت ست عہد را بنیاد زہر طرف کہ نسیمے وزید روزن شد

کھیت کی حفاظت کے لئے جو چھپر وغیرہ بنا لیتے ہین، اس کو خانۂ کشت کہتے ہین، کہتا ہے کہ معشوق کے وعدے ایسے ہین، جیسے خانۂ کشت کہ جدھر سے ہوا کا ذرا جھونکا آیا سوراخ ہو گیا،

خدنگ حجبۂ توفیق امشب در کمانم بود ع۰۰الم در نظر بسیار خوب آمد خطا کردم

کہنا یہ تھا کہ آج مین معشوق کے ظلم سے تنگ آ کر اس کے حق مین بد دعا کرنی چاہتا تھا لیکن اس کے حسن کا خیال آیا، اور رک گیا، اس کو یون ادا کرتا ہے کہ ہرن سامنے آیا مین تیر چلہ مین جوڑ چکا تھا، لیکن ہرن کی ادائین اس قدر آنکھون مین کھب گئین کہ مین نے دانستہ چھوڑ دیا،

۴- وہ اکثر عشق اور عاشقی کی سچی اور صحیح وارداتین بیان کرتا ہے، اس لئے دل پر ان کا خاص اثر ہوتا ہے

خواہی کہ بتو بیش شود عشق نظیری گاہ از نظر خویش بران گاہ نگہ دار

معشوق سے کہتا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ نظیری کا عشق اور بڑھے، تو کبھی اس کو اپنی نظر سے گرا دو، اور کبھی محبت کی نظر سے دیکھ لو،

---

[1] یعنی میری چٹکی کو بہت آرام اور لطف محسوس ہوا،

قاصد جگرم سوخت چہ پیغام وچہ نامہ   دل بود ہمان خوش کہ بامید خبر بود

بادخود نا امیدی بس کہ مشتاق توام   مدعی گر مژدہ وصلم دہد باور کنم

کس قدر عجیب لیکن سچی بات ہے، انسان جب کسی بات کا نہایت مشتاق ہوتا ہے، تو اس کے ہونے کی خبر اگر دشمن بھی آکر بیان کرے تو انسان شوق کی وجہ سے یقین کر لیتا ہے، اس بنا پر کہتا ہے کہ معشوق کے وصل کی خوشخبری خود رقیب بھی آکر دے تو مجھکو یقین آجائے،

مہربانی ادا عتاب دنتوان کرد   کہ تازہ عاشقم وخاطرش بمن صافست

این دل کہ در وصال تسلی از و نبود   خرسند تش از تغافل ودشنام کردہ ایم

یعنی ایک وہ وقت تھا کہ وصل حاصل تھا، لیکن تسلی نہین ہوتی تھی، اور اس سے بھی زیادہ کسی چیز کو دل چاہتا تھا، یا یہ حالت ہے کہ وصل کا کیا ذکر ہے معشوق نظر تک اٹھا کر نہین دیکھتا، اس مایوسی کی حالت مین اگر اتفاقاً اس نے کبھی گالی بھی دیدی تو خوش ہوتا ہون کہ آگے کے لئے امید بندھتی ہے،

کس از معانقہ روز وصل یابد ذوق   کہ چند سب نے ہم آغوش خود جدا خفت ست

شد عمر وسر گرانی او برطرف نشد   با ما بقدر مرتبہ عشق ناز کرد

پایم بہ پیش از سر این کوے رود   یاران خبر دہید کہ این جلوہ گاہ کیست

مُردم از شرمندگی، تا چند با ہر نا کسے   مردمت از دور بنمایند وگویم "یار نیست"

ایک خاص واقعہ کی تصویر کھینچدی ہے، حالت یہ ہے کہ معشوق اکثر کمینون اور ہوس پرستون کے ساتھ رہتا ہے، لوگ جب اس کو کہین راستہ مین کمینون کے ساتھ جاتا ہوا دیکھتے ہین تو دور سے عاشق (نظیری) کو دکھا کر کہتے ہین، دیکھو تمھارا یار جاتا ہے، عاشق غیرت کے مارے کہتا ہے کہ نہین میرا معشوق نہین کوئی اور ہوگا،

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن یار چیزے فزون کند کہ تماشا بما رسید

باعث راندنم نے بوزم بجز عار نبود ورنہ کس را بمن دبودن من کار نہ بود

از یک حدیث لطف کہ آن ہم دروغ بود امشب ز دفتر گلہ صد باب شستہ ایم

یعنی معشوق نے ذرا سی مہربانی سے بات کہی اور تمام شکایتین جاتی رہین،

مرا بسادہ دلیہای من توان بخشید خطا نمودہ ام و چشم آفرین دارم

می گریم و از گریہ چو طفلان خبرم نیست در دل ہوسے ہست و ندانم کہ کدام ست

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے دل مین عشقیہ درد اور گداز پیدا ہوتا ہے، لیکن ابھی کوئی معشوق متعین نہین، اس لئے وہ سمجھ نہین سکتا کہ یہ حالت کیون ہے، اور اس کی تمثیل کس قدر عمدہ دی ہے، بچے روتے ہین لیکن نہین جانتے کہ کیون روتے ہین؟ کیونکہ ان کو جو تکلیف ہو اس کے سمجھنے کی ان کو عقل نہین،

ہمان عشق ست بر خود بستہ چندین داستان ورنہ کسے بر معنی یک حرف صد دفتر نمی سازد

مغل ز نامۂ احباب پر کردوے نخواند کہ می ترسد، شود مکتوب من ہم از میان پیدا

عاشقون کے خطوط کا چنگ ہاتھ مین ہے، لیکن کھول کر پڑھتا نہین کہ کہین میرا خط نہ نکل آئے،

من نخواہم رفت اما بہر تسکین دلش ہر کجا بینید گوئیدش کہ فردا می رود

یعنی مین اس کی گلی سے جاؤن گا تو نہین، لیکن تم لوگ اس سے ملنا تو کہدینا کہ کل چلا جاؤنگا،

نیخ و افسون زلیخا کار در یوسف نہ کرد ہر کہ دل در باخت دل بردن نمیداند کہ چیست

نوازشے زکرم می کند محبت نیست توان شناختن از دوستی مدارا را

یعنی معشوق جو مہربانی کرتا ہے، انسانیت کے لحاظ سے کرتا ہے، محبت نہین، محبت اور

مدار این جو فرق ہے اس کی تمیز خود ہو سکتی ہے،

نظیری کوی عشق ست این نہ شاہد بازی و رندی — کہ گر یارے رود از دست کس یارے دگر گیرد

مشو از حالِ من غافل کہ زخمے کاری دارم — مبادا دیگرے صید ترا از خاک برگیرد

بہر زخمے کہ می گیرند کالائے وفا خوب ست — پس از عمرے گذر افتاد بر من کاروانے را

سوائے کن زمن امروز تا غوغا بشہر افتد — کہ اعجاز فلانی کرد گویا بے زبانی را

مجلس چو پر شکست، تماشا بما رسید — در بزم چون نماند کسے جا بہ ما رسید

۵۔ نظیری کے کلام میں فلسفہ کم ہے لیکن جس قدر ہے نہایت خوبی سے ادا ہوا ہے،

بر چہرۂ حقیقت اگر ماندہ پردۂ — جرم گناہ دیدۂ صورت پرستِ ماست

چند از موزون بشنوم توحید شرک آمیز را — کو عشق تا یکسو نہم، شرع خلاف انگیز را

خضر صد منزل بہ پیشیم آمد و نشناختم — باز می باید ز سر گیرم رہِ پیمودہ را

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو دلیلیں ہمارے سامنے پیش کی گئیں، یا جو مسائل ہمارے سامنے آئے وہ صحیح تھے، لیکن ہم نے اپنی بے پروائی یا کج طبعی یا کُرْدہی کی وجہ سے اُس سے فائدہ نہیں اٹھایا، اس لئے ہم کو نئے دلائل کی ضرورت نہیں، انہی دلائل کو غور سے مکرر دیکھنا چاہئے اسی خیال کو اس شعر میں ادا کیا ہے،

ہر گز عطائے ساقیِ ما را کرانہ نیست — از تنگ ظرفی ست کہ پیمانہ پر شدہ است

زین پیش شیشۂ دل با ہم ز سنگ بود — بے نسبت آشنا دل ما با دلِ تو نیست

شیشہ پتھر سے بناتے ہیں، اس بنا پر کہتا ہے کہ میرے دل کو جو تیرے دل سے ربط ہے، بے وجہ نہیں ہے، یہ شیشہ بھی (عاشق کا دل) پہلے پتھر تھا، (معشوق کا دل پتھر ہوتا ہے) اس لئے ایک قسم کی مناسبت ہی،

اس شعر مین میلانِ جنسیت کے مسئلہ کو عاشقانہ پیرایہ مین ادا کرتا ہے،

ہیچ کس نامۂ سربستۂ ما فہم نہ کرد — نہ ہمین خاتمہ اش نیست کہ عنوانش نیست

یعنی دنیا کے آغاز و انجام کی حقیقت معلوم نہین ہو سکتی

تو مپندار کہ این قصہ ز خود می گویم — گوش نزدیکِ لبم آر کہ آوازے ہست

یعنی جو کچھ کہتا ہون دل مین القا ہوتا ہے تب کہتا ہون،

گر عکسِ روے خویش در آئینہ دیدۂ — توحید شیخ و شرکِ برہمن بجا شناس

یعنی توحید اور شرک دونون صحیح ہین، کیونکہ بت مین بھی کوئی جلوہ ہے جس پر برہمن نثار ہے،

حور جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہ دوست — اندک اندک عشق بر راہ آورد بیگانہ را

یعنی خشک طبع زاہد، معرفت الٰہی کی طرف یون نہین مائل ہو سکتے، اس لئے ان کو حور اور جنت کی چاٹ دلائی جاتی ہے، اس لالچ سے جب وہ ذکر اور شغل مین مصروف ہوتے ہین، تو رفتہ رفتہ جذبِ الٰہی بھی پیدا ہو جاتا ہے،

ہیچ اکسیر بہ تاثیر محبت نہ رسد — کفر آوردم و در عشقِ تو ایمان کردم

کفر و ایمان بنود شرط نظیری در عشق — بتو کافر بنمایم کہ ولایت دارد

روے نکو معالجۂ عمر کوتہ است — این نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ ایم

ما را چہ اعتبار و اثر با وجود دوست — جاے کہ جلوہ کرد حقیقت مجاز نیست

جن ہر سو در لباس دیگرے پنہاں شود — عشق ہر ساعت در آویزد بدامانِ دگر

بہر کارے کہ ہمت می گمارے نصرت از حق جو — کہ بر گنجشک دام افگندم و صید ہما کردم

تا کے چو موج آب بہر سو شتافتن — در عینِ بحر، پاے چو گرداب بند کن

درین میدان پُر نیرنگ، حیران ست دانائے | کہ یک ہنگامہ آرائی ست و صد کشور تماشائے
در طبع دوستان ز حسد راستی نماند | انصاف اگر طلب کنی از دشمنان طلب

تعجب یہ ہے کہ نظیری اگرچہ نہایت مذہبی آدمی تھا، اور اکبر اور ابو الفضل کی لامذہبی پر نہایت لعن طعن کرتا ہے لیکن خود وہی خیالات ظاہر کرتا ہے جو اُس زمانے مین ابو الفضل وغیرہ کی طرف منسوب تھے، چنانچہ کہتا ہے،

بو البشر را قوائے ملائکہ اند | جزو کل را ست در سجود این جا
حضرت آدمؑ کے قوی بھی فرشتہ ہین | اور جزو، کل کو سجدہ کر رہا ہے
نزد تو جبرئیل وحے آورد | عقل برقع ز رخ کشود این جا
تمھارے نزدیک تو جبرئیل وحی لائے | لیکن دراصل وہ خود عقل تھی

۶- اس زمانے کے تمام نامور شعرا کا اصلی جوہر، طرز ادا کی جدت ہے، نظیری اس میدان مین اکثر حریفوں سے آگے ہے،

عشق را کام بعہد دلِ خود کام تو نیست | صبح امید و شبِ وصل در ایامِ تو نیست
گویا اس مین ایک صبح اور ایک رات کم ہے،

از کف نمی دہد دل آسان ربودہ را | دیدیم زور بازوے ناآموزدہ را
بازم بہ کلبہ کیست نہ شمع و نہ آفتاب | بام و درم ز ذرّہ و پروانہ پر شدہ است

میرے گھر مین کون آیا ہے کہ نہ دھوپ ہے نہ شمع، باوجود اس کے در و دیوار پر ذرے اور پروانے ٹوٹ پڑے ہین (یعنی معشوق آفتاب بھی ہے اور شمع بھی)

بے تو دو شم در درازی از شب یلدا گذشت | آفتاب امروز چون برق از سراے ما گذشت
ہیبت حسنش کسے را رخصتِ آہے نداد | گرچہ ہر سو داد خواہی بود، او تنہا گذشت

در آرزوے نثار قدوم تو ہمہ شب | گر فرش دو چشم مرادکان بازست
دعا کنید بوقت شہادتم اورا | کہ این دمے ست کہ درہای آسمان بازست

اس شعر مین جدتِ ادا کے ساتھ ایثار نفس کے مضمون کو نہایت بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہے، عاشق قتل کیا گیا ہے، اس تقریب مین آسمان کے دروازے کھل گئے ہین، اس حالت مین عاشق کو سب سے پہلے جو خیال آتا ہے وہ یہ ہے کہ معشوق کے حق مین لوگون کو دعا کرنی چاہیے کیونکہ یہ قبولِ دعا کا وقت ہی،

عارفان گوشۂ چشمے بدو عالم ندہند | ہر کجا یار نقاب از رخِ زیبا برداشت
این قبلۂ کہ کج شدہ طرفِ کلاہ کیست

گرچہ میدانم قسم خوردن بجانت خوب نیست | ہم بجان تو کہ یادم نیست سوگندِ دگر

اس شوخی کو دیکھو، کہتا ہے کہ مین جانتا ہون کہ تمھاری جان کی قسم کھانا اچھی بات نہین، لیکن تیری جان ہی کی قسم کہ مجھ کو اور کوئی قسم یاد ہی نہین، شوخی اور بلاغت یہ ہی کہ قسم نہ کھانے پر بھی قسم کھائے جاتا ہے، اور اس لطف سے کہ گویا اس کو خبر نہین کہ اس نے قسم کھالی، اسی مین یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ اس کو اور کوئی قسم یاد نہین،

قسمت چنین فتاد کہ ترکانِ مستِ او | در دورِ ما بطاق نہادند جام را

کنایہ یہ تھا کہ ہم معشوق کی نگاہ سے محروم ہین، اس کو یون کہتا ہے کہ ہماری قسمت ایسی واقع ہوئی کہ ہمارے زمانے مین ان ترکون (معشوق کی آنکھین) نے پیالہ اٹھا کر طاق پر رکھدیا، اور شراب پینی پلانی چھوڑ دی،

ہیچ دل را ستم حادثہ مجروح نہ کرد | کہ نہ لعل تو برو در یخت نمکدانے چند
تو گہ بر ہم زنی سودائے دل نازنینان زا | مرا سرمایۂ دنیا و دین نابود می گردد

یعنی دل کی خرید و فروخت کا جو معاملہ طے ہو چکا ہے، اس کو تو اگر توڑ دے تو تیرا صرف ایک ناز ہی کا نقصان ہوگا، لیکن میرا تو دین اور دنیا کا جو کچھ سرمایہ ہے (یعنی دل) سب جاتا رہیگا

چنان برہم زدی ہنگامۂ شورِ قیامت را — کہ اکثر نامۂ اعمال ہر دم از میان گم شد

با تو گستاخی ست گفتن ترک بدخوے نما — با دلِ خود گفتہ ام آئینہ را بے سنگ ساز

مقصد یہ ہے کہ معشوق تو بدمزاجی چھوڑ نہین سکتا، اس لئے مین نے اپنے دل کو برداشت کرنے کی عادت ڈال دی ہے، اس مطلب کو یون ادا کرتا ہے (معشوق سے مخاطب ہو کر) تم سے یہ کہنا تو گستاخی ہے کہ بدمزاجی چھوڑ دو، لیکن مین نے اپنے دل سے کہہ دیا ہو کہ آئینہ ایسا بناؤ جس کو زنگ نہ لگنے پائے،

بدل طرحِ وصال جاودانی نقش می بندم — اگر خود دوست می آید بخلوت دشمن ست امشب

عشق بازیم بمعشوق مزاجی انداخت — زان بنازے کہ بہ او ہست مرا نازے ہست

یعنی عشق کرتے کرتے مجھ مین معشوق مزاجی آگئی، مجھ کو اس پر ناز ہے کہ مین اسکا نیازمند ہون

میخواست بوسہ رخت اقامت بگستر د — از فرش جبہہ راہ بران خاک کو نبود

مقصد یہ ہے کہ مین اس کی گلی کی خاک کو بوسہ دینا چاہتا تھا، لیکن اس قدر کثرت سے لوگ پیشانی رگڑ رہے تھے کہ جگہ نہ تھی، اس مطلب کو یون ادا کرتا ہے کہ بوسہ نے چاہا کہ وہان قیام کے لئے بستر بچھائے، لیکن پیشانیون کا فرش بچھا ہوا تھا، اس لئے جگہ نہ ملی،

دہر چون درد دشمنی ست ست افگندم بہر — دشمنِ نامرد را من مرد میدان نیستم

درین عشرت کہ من جان می سپارم — نمی گرید بہر گم مادرم امروز

قاصد کہ می فرستی رطل گرانش درد — کر نا خبر بیا بد تا بے خبر نا شد

یعنی قاصد جو بھیجنا تو خوب شراب پلوا کے بھیجنا، کیونکہ جب تک خود بے خبر نہ ہوگا، میری

خبر اس کو نہ معلوم ہو سکے گی، مطلب یہ ہے کہ جب تک عشق آشنا نہ ہو گا، میرے عشق کا حال کیا جان سکے گا،

در دیارے کہ سجودِ خمِ ابرو رسم ست　　　غیر محراب کج وقبلۂ دیران مطلب

مقصد یہ ہے کہ جہان عشق کا چرچا ہو گا وہان زہد وعبادت کرنا بے فائدہ ہے،

گرہ بر جبین ابرو از چہ داری　　　سر این نامہ پیچیدہ بکشا

اگر بمہر کہ در خون فتادہ ام چہ عجب　　　ہمیشہ رزم بخود چون تہمتنی است مرا

ایک دقیق خیال کو ادا کیا ہے، کہنا یہ ہے کہ مین دوسرون کی راے پر تو غالب آجاتا ہون لیکن خود میرا دل میرا مخالف رہتا ہے، اور اس کی خواہشون کو مغلوب کرنا پڑتا ہے۔ اس مین مجھکو اکثر ناکامی ہوتی ہے اور نقصان اُٹھاتا ہون، اس خیال کو یون ادا کرتا ہے کہ اگر مین معرکے مین زخمی ہوا، تو کیا تعجب، کیونکہ مجھ کو اپنے جیسے رستم سے لڑنا پڑتا ہے، یعنی مین خود رستم ہون اور اپنے آپ سے لڑتا ہون،

اگر در خدمت عمرے است می بندم شند قدم　　　برہمن می شدم، گر این قدر زنار می بستم

۷، وہ غزلون مین کسی حالت کو مسلسل لکھتا جاتا ہے اور غزل کی غزل اسی ایک حالت کے بیان مین تمام ہو جاتی ہے، ان موقعون پر اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک مضمون کی تمام جزئیات کو کس طرح احاطہ کرتا ہے، کس خوبی سے تسلسل بیان کو قائم رکھتا ہے، کس طرح عشق وعاشقی کی ایک ایک ادا سے واقف ہے، اس کے ساتھ رنگینی استعارات، جدتِ اسلوب اور شیرین زبانی، کلام کو سحر سامری بنا دیتی ہے، مثلاً ایک غزل مین وصل کی حالت ادا کرتا ہے،

دارم درین دیار مغان شیوہ دلبری　　　بیخود خوش و میانہ خوش و ہوشیار خوش

اس شہر مین میرا ایک معشوق ہے جس کی ادائین مغبچون کی سی ہین، وہ مستی مین بھی، ہوش مین بھی

اور درمیانی حالت مین بھی خوش ادا ہے،

دستار افگند خم کاکل پراگند — کاین ست وضع صحبت رندان سان نگار خویش

ٹوپی اتار کر رکھ دیتا ہے اور بالون کو بکھرا دیتا ہے، اس لئے کہ صحبت کا یہی انداز ہے،

اور معشوق اسی رنگ مین دلکش معلوم ہوتا ہے،

شاد و شگفتہ، مطرب و ساغر طلب کند — یک سو نہد حجاب و در آید بکار خویش

خوشی سے کھل جاتا ہے اور مطرب اور شراب طلب کرتا ہے، شرم اٹھا دیتا ہوا اور کام

مین لگ جاتا ہے،

ہر گہ کند شتاب بہ رفتن کہ دیر شد — تسکین دہم دلش کہ سکون و قرار خویش

جب جانے کے لئے جلدی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دیر ہوئی جاتی ہے تو مین اسکو روکتا

ہون کہ سکون اور قرار اچھی بات ہے،

تا دم زند کہ روز چہ رفت و ز ہفتہ چیست — نگذارمش شمار کہ بنود شمار خویش

جب یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ کون سا ہفتہ ہے؟ اور دن کتنا چڑھا؟ تو مین اس کو یہ پوچھ گچھ

کرنے نہین دیتا، کیونکہ پوچھ گچھ اچھی بات نہین،

او در وداع و من بجزع کز مے و بہار — رطلے سہ چار ماندہ و روزے سہ چار خویش

وہ رخصت ہونا چاہتا ہے اور مین روتا ہون کیونکہ شراب اور بہار مین سے یہی دو تین

پیالے اور دو تین دن مزے کے رہ گئے ہین،

ساغر کنم لبالب و گویم سبک بنوش — در موسم بہار نہ باشد خمار خوش

مین پیالہ بھرتا ہون اور کہتا ہون کہ آہستہ سے چڑھا جا، کیونکہ بہار مین خمار اچھی چیز نہین،

چندان کہ گویمش گذران ست عمر باش — گو باد صبا روانہ بہ وگل سوار خویش

مین ہر چند کہتا ہون کہ عمر گذری جاتی ہے، ذرا ٹھہر جاؤ، وہ کہتا ہے کہ صبا کا روانہ ہونا ہی اچھا ہے، اور پھول کا سفر کرنا ہی بہتر ہے،

کارے بہ لابہ پیش نظیری نمی رود | باشد باو گذاشتن اختیار خوش

اے نظیری! اب خوشامد کچھ پیش نہین جاتی اس لئے اب اسی کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہئے

ایک غزل مین یہ حالت بیان کی ہے کہ معشوق خود کسی حسین پر عاشق ہو گیا ہے اس حالت مین جو جو واقعات پیش آسکتے ہین، ان کو بیان کیا ہے، اور کس دلآویزی سے بیان کیا ہے،

چشمش برا ہے تیر و مژگانِ نمک کش نگر | در سینہ دار داتشے، پیراہنِ چاکش نگر

دامے کہ زلف انداختہ در گردن سیمینش بین | خونے کہ مژگان ریختہ بر دامنِ پاکش نگر

زلف نے جو جال ڈالا تھا، اب خود اس کی سیمین گردن مین ہے، مژگان نے جو آنسو گرائے ہین، اس کے پاک دامن پر پڑے ہوئے ہین،

شرم از میان برخاستہ مہر از دہان برداشتہ | گفتار بے ترسش ببین رفتار بیباکش نگر

شرم اور حجاب جاتا رہا، زبان کھل پڑی اسکی بے جھجھک باتین اور بیباکانہ رفتار دیکھنے کے قابل ہے،

از کوی معشوق آمدہ شوریدگان در حلقہ اش | از صید آہو می رسد شیران بفتراکش نگر

معشوق کی گلی سے آیا ہے، اور عاشقون کا جھرمٹ ساتھ ہے، ہرن کو شکار کرکے آیا ہے اور فتراک مین شیر دہین

دل بردہ و دل باختن معشوق عاشق پیشہ بین | بگرفتہ در انداختن بازوے چالاکش نگر

عاشقی مین معشوقی دیکھو کہ دوسرے کو دیتے دیتے خود اس کا دل اڑا لیا،

۸۔ نظیری نے روزمرہ اور محاورات نہایت کثرت سے برتتے ہین، جس سے زباندانی مین بہت مدد ملتی ہے، اس کے ساتھ اکثر محاورات وہ ایسے استعمال کرتا ہے کہ جس مطلب کو ادا کرنا چاہتا ہے، بغیر اس محاورہ کے وہ اس خوبی کے ساتھ ادا نہین ہو سکتا تھا، مثالون

سے اس کا اندازہ ہوگا،

طفل بودیم کہ باز از شکر و شیر شدیم — از شیر باز شدن: دودھ چھڑایا جانا،

سخت است حال مشکل اگر تا سحر کشم — حالت سخت ہی مشکل ہی کہ صبح تک بچ جاوین

شبنم پری بسبزۂ نرگس بخواب گیر — بخواب گرفتن: سوتے مین جالینا

نیم بسمل شدۂ بر سر پروازے ہست — بر سر پرواز: اڑنے کو ہے،

شرح سوداے ترا نسخہ زسیما بردا شت — نسخہ برداشتن: کتاب کا نقل کرنا۔

شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد — افسانہ از افسانہ می خیزد: بات سے بات نکلتی ہے

اس قسم کے سیکڑون روزمرے اور محاورے اس کے کلام مین مل سکتے ہین،

طالب آملی

(ملک الشعراے دربار جہانگیری)

سلسلۂ تیموریہ مین یون تو ہر فرمان روا سخن فہم و داشناس گذرا ہے، لیکن جہانگیر اس فن مین اجتہاد کا درجہ رکھتا تھا، وہ فطرۃً محبت کیش تھا، اور ازل سے درد مند دل لے کر آیا تھا اسکا اثر گو اس نے آئین و نظام سلطنت مین چندان نمایان نہ ہونے دیا، یہانتک کہ تزک مین نورجہان کا جہان جہان ذکر آیا ہے مطلق نہین معلوم ہوتا کہ یہ نام اس کی زبان سے لذت لیکر نکلتا ہے، تاہم عشق اس کا خمیر تھا، اور چونکہ فیضی کا شاگرد رشید تھا، اس لئے شعر و شاعری کا نکتہ دان اس سے بڑھ کر کون ہوسکتا تھا، شہزادگی کے زمانہ سے شعرا اس کے دربار مین ملازم رہتے تھے، تختِ سلطنت پر بیٹھا تو دربار شعرا سے بھرا ہوا تھا، لیکن ملک الشعرائی کا تاج اس نے طالب آملی کے سر پر رکھا، جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ شاعر کس پایہ کا ہوگا، یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اس وقت طالب کا سن ۲۰ برس سے زیادہ نہ تھا، اس عمر مین یہ اعزاز، خاص اسی شاعر کا کارنامۂ اقبال ہے،

طالب آمل کا رہنے والا تھا، جو مازندران کا ایک شہر ہے، بچپن مین درسی علوم و فنون کی تعلیم پائی، اور اگر اس کے دعوی پر اعتبار کیا جائے تو ۱۵-۱۶ برس کی عمر مین اس نے ہندسہ، منطق، ہیئت، فلسفہ، تصوف، اور خوش نویسی مین کمال حاصل کر لیا تھا، چنانچہ ایک قصیدہ مین لکھتا ہے،

پا بردو مین پایۂ اوج عشر اتم — وانیک عدد فنم از آلاف ، زیاد است

برہندسی و منطقی و ہیئت و حکمت — دستی است مرا کش ید بیضا نہ عبا داست

وین جملہ چو حظ شد تمکین علم حقیقت — کاستاد علوم ست بر این جملہ فرا داست

در سلسلۂ وصفِ خط این بس کہ زکلکم — ہر نقطہ سویدا ے دلِ اہل سواد است

پوشم نسب شعر، چو دانم کہ تو دانی — کاین پایہ امرا تا من این سبع شداد است

گو رواجِ عام کے لحاظ سے اس نے یہ تمام علوم حاصل کیے، لیکن وہ دراصل شاعری کیلئے پیدا ہوا تھا، اس لیے اسی کو اپنا فن قرار دیا،

اس زمانہ مین ماژندران کا حاکم جس کو ایران کی اصطلاح مین وزیر کہتے تھے، میرابوالقاسم تھا، اس کی مدح مین متعدد قصائد لکھے، ایک قصیدہ کا یہ مطلع ہے، اور غالباً یہ پہلا قصیدہ ہے

سحر کہ غنچہ کشاید گرہ ز پیشانی — ز ند دم از دمِ عیسٰی نسیم بستانی

سحر کہ طرۂ پیچانِ مشک ساسی نسیم — بطرفِ عارضِ گلبن کند پریشانی

معلوم نہین کہ کن اسباب سے یہان طبیعت سیر ہوئی اور کاشان مین آیا، یہان مستقل سکونت اختیار کی، اور شادی بھی کر لی، تذکرۂ میخانہ مین لکھا ہے کہ اس کی شاعری کا نشو و نما نہین ہوا، لیکن چند روز کے بعد یہان سے بھی برداشتہ خاطر ہو کر مرو مین آیا، یہ عباس صفوی کا زمانہ تھا، اور ملکش خان صوبے کا گورنر تھا، طالب نے ملکش خان کے دربار مین رسائی حاصل کی اور مدحیہ قصائد لکھے، دو برس تک یہان قیام رہا، ملکش خان نے قدردانی مین کمی نہ کی ہو گی، لیکن طالب ہندوستان کی فیاضیون کا خواب دیکھا کرتا تھا، ایک مثنوی لکھ کر ملکش خان سے وطن جانے کی اجازت حاصل کی، ابتدا مین لمبی چوڑی تمہید لکھی، پھر حرفِ مطلب اس طرح ادا کیا،

۱؎ یعنی ابھی مین نے دوسری دہائی مین قدم رکھا ہے،

یکے بر حرفِ طالب گوش بکشاے | صدف را بر گہر آغوش بکشاے
دو سال آمد کہ از محنت کشان است | تراچون بوسہ فرش آستان است
بہ کلی کردہ از مسکن فراموش | یکے گردیدہ رندے خانہ بردوش
نہ از خویشان کند نزد اقربا یاد | بہ دیدار تو دارد خویش را شاد
اگر لطف نوازش دستور بخشند | چو خور کو ذرہ را نور بخشند
عنان سوے وطن تابیدہ چندی | کند خویشان خود را ارجمندی
دو روزے با غم آشامان سرآرد | دگر رہ سوے طوفِ این در آرد
بدین درگہ رساند خویشتن را | ز سر بیرون کند شور وطن را

وطن کا بہانہ تو اس لئے تھا کہ ہندوستان کا نام لیتا تو اجازت کیونکر ملتی، ملکش خان سے رخصت ہو کر، طالب نے سیدھا ہندوستان کا راستہ لیا اور اس وقت یہ رباعی لکھی،[1]

طالب! گل این چمن بہ بستان بگذار | بگذار کہ می شوی، پشیمان بگذار
ہندو نہ برد تحفہ، کسی جانب ہند | بخت سیہِ خویش بہ ایران بگذار

مطلب یہ ہے کہ ہندوستان مین کالی چیز، تحفے کر نہین جاتے، اس لئے بختِ سیہ کو یہین چھوڑ کر چلنا چاہیئے،

میخانہ کے مصنف نے جو خود طالب کا ہمعصر اور ہم صحبت تھا، لکھا ہے کہ طالب مرد سے نکل کر سیدھا قندھار پہنچا، لیکن یہ تعجب انگیز غلطی ہے، قندھار جانے کا حال طالب نے خود ایک قصیدہ مین لکھا ہے، اس سے صراحۃً ثابت ہے کہ وہ ہندوستان مین برسون رہ کر قندھار گیا ہے، چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے،

[1] تذکرۂ میخانہ،

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اول جب وہ ہندوستان میں آیا تو یہان اس کو کامیابی نہین ہوئی، اور اس وجہ سے وہ تمام مشہور مقامات مین بہ تلاشِ معاش پھرتا رہا، دلی، لاہور، ملتان، سرہند، ان مقامات کا ذکر اس نے بہ تخصیص کیا ہے، لاہور مین زیادہ دل لگا، چنانچہ لاہور کی مدح مین ایک خاص قصیدہ لکھا ہے جس کے چند اشعار یہ ہین،

گمانم نیست کاندر ہفت کشور | بود شہرے بہ آب و تابِ لاہور
میان بکشائے خوش داکش کہ در ہند | فراغت نیست جز در خوابِ لاہور

یہان اس نے شاہ ابو المعالی کی خدمت مین بیعت حاصل کی، چنانچہ کہتا ہے۔

کنم زان رو مریدآسا شب و روز | گرا متھا بیان در بابِ لاہور
کہ پیر و دستگیر و مرشد من | یکے قطب است از اقطابِ لاہور
خدایا زندۂ جاوید دارش | بہ آب خضر یعنی آبِ لاہور

ان شہرون مین وہ رندانہ وضع سے رہا اور خرمن حسن کی خوشہ چینی کرتا رہا خوش قسمتی سے حسینون نے بھی اپنے پہلو مین اسکو جگہ دی، چنانچہ جب ہندوستان چھوڑ کر قندھار جانے ہے تو جس گرمجوشی سے ان فتنہ گردن نے اسکو روکا ہے، اسکی تصویر اس طرح کھینچی ہے،

نگارانِ لاہور و خوبانِ دہلی | بدل کردہ بودند پیوند جانم
یکے چہرہ سودے بچشم رکابم | یکے بوسہ دادے بزلفِ عنانم
فشاندی یکے در بغل یاسمینم | نہادے یکے در دہان برگِ پانم
غزالانِ ملتان بہ نیرنگ سازی | کہ بندند از غمزہ دست و دہانم
من از جملہ چون نکہت گل گریزان | کہ خود را بہ بزم ہمایون رسانم

اس زمانہ مین غازی خان وقاری، امرای جہانگیری مین نہایت ممتاز تھا، اس کا باپ

مرزا غازی سنہ ۱۰۰۱ ہجری مین اکبر کے حکم سے ٹھٹھ کا صوبہ دار مقرر ہوا تھا، سنہ ۱۰۰۸ء مین جب اس کا انتقال ہوا تو غازی خان باپ کا جانشین ہوا، جہانگیر نے اپنے عہد سلطنت مین اس کو قندھار کا گورنر مقرر کیا، اور سندھ کا علاقہ جاگیر مین دیا، وہ نہایت قابل اور دریا دل تھا، اکثر اہل کمال مثلاً اسد قصہ خوان، مرشد بروجردی، میر نعمت اللہ وغیرہ نے اس کے دامنِ تربیت مین تعلیم پائی ہے، ایران سے جو اہلِ کمال ہندوستان کا رخ کرتے تھے، ان کی پہلی منزل اسی کا آستانہ ہوتا تھا،

شاعری مین مشہور شعرا کا ہم پلہ تھا، وقاری تخلص کرتا تھا، پانچ ہزار شعرون کا دیوان یادگار مین چھوڑا، میخانہ مین اس کے ساقی نامہ کے بہت سے اشعار نقل کئے ہین، غزل کا یہ رنگ ہے،

در عہدِ تو مارا ہمہ با غیر خطاب است — ہر پنجۂ مژگان و گریبان عتاب است

گریہ ام گر سبب خندۂ او شد چہ عجب — ابر ہر چند کہ گرید رخ گلشن خندد

کجاست یک دو سہ ہمدم کہ ہمچو موسیقار — نشستہ پہلوی ہم برکشیم آوازی

غرض اس کی قدردانی کی شہرت نے طالب کو قندھار جانے پر آمادہ کیا، پہلے ایک قصیدہ لکھ کو بھیجا جس مین حاضری کی استدعا کی، تمہید کے بعد اصلِ مطلب اس طرح ادا کیا،

یکے بلبلِ بے پر و بالِ شوقم — کہ محرومی از طوفِ گلزار دارم

درین خستہ آباد نے روی ماندن — نہ سامانِ یک گام، رفتار دارم

ندانم چرا یارب این سان خوارم — چو لطفِ خداوند اعتبار دارم

صف آرای تیغ و قلم خان غازی — کہ لب در ثنایش گہر بار دارم

بلند آشیانے کہ در زیر بالش — بہر رخ کو لبِ اشکِ سیار دارم

ہمہ از آستانش ز رشکِ دماغم — سر آستین رشکِ گلزار دارم

آگرہ سے لاہور تنہا ہوتا ہوا قندھار پہنچا، چونکہ برسات کے دن تھے، راستہ مین بہت تکلیف اٹھائی، ملتان مین چار مہینے قیام کرنا پڑا، چنانچہ پہلا قصیدہ جو غازی خان کے دربار مین پیش کیا ہے اس مین یہ تمام حالات لکھے ہین،

خدائے داند و من بندہ کاندرین مدت | چہا کشیدہ ام از حادثات دورانی
درین سفر کہ نصیبم مباد دیگر بار | بگو نہ گو نہ غمم بود صحبت جانی
ز اختلاط تی باران برشنگالی را | ز من مپرس کہ این قصہ نیست پایانی
ز آگرہ تا بخیابان گلشن لاہور | رفیق بود مرا بارہائے بارانی
بعزم ملتان چون رفتہ شدم چو ہلال | ز دوازسر شکم نیلاب (دریا کا نام) کوہ عمانی
ز گشت ملتان نزدیک شد بدان کہ مرا | بدل شود لقب آملی بملتانی
دران مضیق ملالت، چہار مہ بودم | بسان قطرہ ایستادہ در تمام حیرانی

غازی خان نے خاطر خواہ قدردانی کی اور مقربان خاص مین داخل کیا، طالب نے بہت سے پر زور قصیدے اس کی مدح مین لکھے ہین، جس مین مداحی سے گذر کر عاشقی کا دعوی کیا ہے،

تکلف نیست معشوق من ست او نیست ممدوحم | ازان این شعر عشق آمیز در مدحش ہمی رانیم

بد قسمتی سے غازی خان ۱۰۲۱ھ مین جبکہ اس کی عمر صرف ۲۵ برس کی تھی، اپنے ایک غلام کے ہاتھ سے مسموم ہوا۔ طالب کے لیے اب کوئی ٹھکانا نہ رہا، مجبوراً اس نے پھر ہندوستان کا رخ کیا، اور آگرہ مین آیا، خواجہ قاسم دیانت خان نے جو امرائے جہانگیری مین حضور رس تھا، اس کی قدردانی کی اور عبد اللہ خان فیروز جنگ کے نام جو اسی سنہ مین گجرات کا حاکم مقرر ہوا تھا، اس کی سفارش مین خط لکھا، عبد اللہ خان نے خط بھیج کر بلایا۔ طالب نے اس رقعہ کو

لہ آگرہ کو ایرانی شعرا ہمیشہ اگرہ لکھتے ہین،

بڑے فخر اور ناز سے لکھا ہے[1]

صبا رفتار پیکے۔ در طلوعِ صبحِ نورانی — بگوشم زد صدائے زنگ[2] چون بانگِ سلیمانی
ز سیر آہنگی آن نغمہ مست از جائے برجستم — بہر جانب نگاہے تاختم از روئے حیرانی
یکے باد غبار آلودہ بر در، جلوہ گر دیدم — عرق ریزان چو مرواریدش از اطراف پیشانی
دویدم پیش و گفتم خیر مقدم، دانگہ افشاندم — بپایش مشتے از ناسفتہ گوہرہائے مژگانی
گلاب آوردم و پیشانیش از گرد در شستم — دریغا کاش بودے قدر تیم بر آبِ حیوانی
بپایش آشنا کردم بسے وز گرد نعلینش — نمودم سرمہ دانِ دیدہ پر کحلِ صفاہانی
پس از مے با ہزاران شوق بیتابانہ پرسیدم — کہ اے جاروب راہت شہپر مرغِ سلیمانی
لبت آبستنِ رمزے ست، گو یا مژدۂ داری — گرمی بار و زرویت ہمچو گل آثار خندانی
چو بشنید این سخن بکشود لب آنگاہ چون طوطی — زبان را چاشنی داد از ادائے شکر افشانی
بگفت اے عندلیبِ گلشنِ معنی کہ بر یادت — قدح نوشند، خوش طبعانِ ایرانی و تورانی
بشارت باد کانیک با ہزاران مژدہ آوردم — خطِ آزادی مرغِ دلت از دام حیرانی
دراثنائے تکلم کاغذین درجے پر از گوہر — بتو بسیدہ بدستم داد و از روئے روشن دانی
من آن منشورِ دولت چون بدستِ خویشتن دیدم — شدم سرتا قدم بہرِ سجود شکر پیشانی
بسوئے قبلۂ گجرات رو تسلیم ہا کردم — بہ آدابے کہ بر من کرد گردون آفرین خوانی
پس از تسلیم بکشودم ز عنوان مہر شکینش — چہ دیدم آفتابے چند در جلبابِ ظلمانی
شدم شاداب تر، چون مہر عنوان را رقم دیدم — بنامِ نامیِ سرچشمۂ توفیقِ یزدانی

[1] آگرہ مین آنے اور قاسم خان کی سفارش کا حال میخانہ مین لکھا ہے [2] زنگ گھونگھرو کو کہتے ہین اس زمانے مین ڈاک کے ہرکارے گھونگھرو باندھ کر چلتے تھے، یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔

سحابِ فیضِ عبد اللہ خان آن مظہر احسان | کہ نے بحری ز دستِ ہمتش جان برد، نی کانی

طبیعتون کا اختلاف دیکھو! عرفی کو خود جہانگیر نے قاصد بھیج کر بلایا تھا، لیکن وہ قاصد کی نسبت اس قدر کہہ کر رہ گیا،

کہ ناگہان ز درم در رسید مژدہ دہی | چنان کہ از چمن طالسمم بہ مغز شمیم

بخلاف اس کے طالب ایک معمولی امیر کے ہرکارے کے پانون چومتا ہے، اسکی پیشانی کی گرد گلاب سے دھوتا ہے، اور حسرت کرتا ہے کہ آبِ حیات کہان سے لاؤن،

عبد اللہ خان نے حد سے زیادہ طالب کی عزت کی اور انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا[1]، طالب نے عبد اللہ خان سے درخواست کی کہ آپ دربار مین جائین تو مجھ کو بھی ساتھ لیتے چلین چنانچہ ایک قصیدہ مین کہتا ہے،

آسمان قدرا! چو داری در خیال | عزم درگاہِ شہنشاہِ زمان

وز جوان مردانِ ایرانی سپاہ | برگزیدہ ستے چہل شیر ژیان

گر بہ من در جرگۂ شیران نیم | لیک از اخلاص دارم چشم آن

کز نظر چون بگذرد تفصیل اسم | نامِ طالب نیز باشد درمیان

غالباً عبد اللہ خان سے یہ خدمت انجام نہ ہو سکی، اس لئے طالب نے اور تدبیرین اختیار کین شاپور طہرانی ایک مشہور شاعر تھا، وہ نور جہان بیگم سے قریبی قرابت رکھتا تھا، یعنی اس کا باپ، اعتماد الدولہ کا جو نور جہان بیگم کا باپ تھا، حقیقی چچا تھا، وہ تجارت کرتا تھا، اور اکثر اعتماد الدولہ کے ہان اس تقریب سے آمد و رفت تھی، طالب نے شاپور سے راہ و رسم پیدا کی، لاہور مین اس سے جا کر ملا، ایک غزل مین اس واقعہ کا ذکر بھی کیا ہے،

---

[1] میخانہ،

بحمد اللہ کہ در ملک سخن دستور را دیدم ... ہمان رشک عطارد شاعر مشہور را دیدم
بہ خسرو داشتم روے نیازے در سخن طالب ... از و در سوختم چون صنعت شاپور را دیدم
چہ خوش عالم کہ بعد از مدت یک سالہ مہجوری ... خوش و خوش وقت او را دیدم و لاہور را دیدم

غرض شاپور کے ذریعہ یا کسی اور تحریک سے اعتماد الدولہ کے دربار مین رسائی ہوئی،

اعتماد الدولہ نے اس کو دامن تربیت مین لیا اور خاص توجہ مبذول کی، تذکرۂ میخانہ مین لکھا ہے کہ جہانگیر کے دربار مین، اعتماد الدولہ ہی نے اس کی تقریب کی، لیکن اور تذکرون اور دیگر قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ اول اول اس کو دیانت خان نے دربار مین پیش کیا، جو جہانگیر کی خدمت مین خاص تقرب رکھتا تھا، جہانگیر کے سامنے اس نے طالب کی اس قدر تعریف کی کہ جہانگیر نہایت مشتاق ہوا، دیانت خان خود ساتھ لے کر گیا، لیکن طالب نے حماقت سے چلتے وقت مفرح[1] کا استعمال کیا، جس سے اس کے حواس جلتے رہے،

جہانگیر نے مہربانی سے باتین کرنی چاہین، لیکن طالب پتھر کی تصویر تھا، دیانت خان کو سخت ندامت ہوئی، طالب گھر پر واپس آیا تو اس کی معذرت مین فی البدیہہ ۷ شعرون کا ایک قطعہ لکھ کر دیانت خان کی خدمت مین بھیجا، مدح کے بعد جہان سے اصل مطلب شروع کیا ہے اس موقع کے چند اشعار یہ ہین،

چہ لطفہا کہ نمودی دئی نمائی نیز ... بہر غریب و مسافر علی الخصوص بمن

[1] یہ ایک معجون تھا جو شراب کے بجاے استعمال کیا جاتا تھا، اور حمقا اس کو شراب کے بجاے کام مین لاتے تھے، کلیم نے اسی کی طرف اس قطعہ مین اشارہ کیا ہے،

بلند قدر امیرا گشتگان وادی غم ... مفرحے پے رفع ملال می خواہند
چو بادہ بے تو حرام است زان نمی طلبند ... حرام عیشان رکیف حلال می خواہند

نخست آنکہ چو در عزّتم نظر کردی   بہ مہر بردی از خاطرم ہوای وطن

چہارم آنکہ بہ بزم شہنشہم بردی   چو دل بہ پہلوی خود ساختی مرا مسکن

بپادشاہم سرگرم گفت و گو کردی   بمہر دیدی خفاش را حریف سخن

تو آنچہ باید کردی، ولیک طالع شوم   بدستیاری گردون نفاق زد با من

بہ بست نطق مرا بخت بد زبان بستن   کشود بر من، ہم دست طعنہ ہم دشمن

گرانگمان کہ چو من استعارہ پردازی   بصد زبان فصاحت بیان شود الکن

گرا گمان کہ گسستۂ کلام مرا   چو تار زلف عروسان شکن بروی شکن

ازین قیاس شہا، غور کن کہ قدرت کیست؟   بیکدم و لحظہ چنین قطعۂ ادا کردن

دو چیز نہر زبان سخنوری گردید   مرا بہ بزم شہنشاہ خوش عیار سخن

یکی زبونی طالع کہ دایم از اثرش   بہر دو بار قرینم بہ گونہ گونہ محن

دگر زیادتی نشۂ کہ نامش را   نمی توانم از شرم بر لب آوردن

ادا صریح کنم تا گمان مبری   چرا کہ شستہ ام از وی بصد آب دہن

مفرحہ زدہ بودم بہ قصد گفتن شعر   عروج نشۂ آن کرد ہر چہ کرد بمن

بہ بزم بادشہم زال زبان نمی گردید   کہ گشتہ بود مرا خشک از زبان دہن

سخن شناسا! پیش تو چون بر آرم سر   کز انفعال سرم غوطہ خوردہ در گردن

دگر نہ جرم مرا عفو کن بہ لطف عمیم   کہ خوش نما است خطای نکردہ بخشیدن

من ارچہ بیگنہم بخت من گنہگار است   گناہ بخت مرا لطف کن بہ بخشش بمن

اعتماد الدولہ نے طالب کو مہرداری کی خدمت سپرد کی۔ یہ خدمت اگرچہ ایک معزز خدمت تھی، لیکن طالب شاعری کے سوا اور کسی کام کا نہ تھا، چونکہ بے دلی سے اس کام کو انجام

دیتا تھا، اس لئے ایسی بے عنوانیاں اس سے سرزد ہو جاتی تھیں کہ اس کو شرمندہ ہونا پڑتا تھا، آخر اس نے ایک قصیدہ لکھ کر اعتماد الدولہ کی خدمت میں پیش کیا، اور اس خدمت سے مستعفی ہو گیا، قصیدے کے چند اشعار یہ ہیں،

دو زہر ست در ساغرم ہر دو قاتل — دو زخم است بر سینہ ام ہر دو کاری

یکی آنکہ بے جواہش نفس و کوشش — بردیم شگفت این گلِ شرمساری

دگر آن کہ شد رنجہ یارے کہ با من — ز دوے مو بموئیش دم از دوستداری

نیم ز اہلِ دیوان بدفتر چہ کارم — مرا شاعری زیبد و می گساری

بمن خدمتِ مدح فرمودن اولے — کہ بس عاشقم بر جواہر نثاری

نہ چسپد بر اہلِ سخن، شغلِ دنیا — چو بر پیر میخانہ پرہیزگاری

ز شاعر ثنا سنجی آید نہ خدمت — کہ بلبل نواخوان بود نہ شکاری

خصوصاً چو من شاعرے کز تجرد — بہ روحانیان زیبدم ہم قطاری

منت بندہ داعندار قدیمم — بخادم کنون فرض خود می سپاری

چو مہر تو دارم چہ حاجت بمہرم — مرا مہرداری بہ از مہرداری

حق این است اما ز حرمی کہ رفتہ — ہمہ انفعالم، ہمہ شرمساری

ہمین خجلتم دور دار در خدمت — چو ابلیس مجرم ز درگاہ باری

دگر نہ ہمان طالبِ حق شناسم — ز سر تا قدم شوقِ خدمتگذاری

اعتماد الدولہ نے اس کی تقریب دربار شاہی میں کی، جہانگیر نے بلا کر زمرۂ شعراء میں داخل کیا، اور ۱۰۲۸ھ میں ملک الشعرائی کا خطاب عنایت کیا، چنانچہ خود تزک میں لکھتا ہے،

"درین تاریخ طالب آملی بخطاب ملک الشعرائی خلعت امتیاز پوشیدہ اصل او

ازآں ست. یک چندے بہ اعتماد الدولہ می بود. چوں رتبہ سخن از ہمگنان درگذشت سلک

شعراے پاے تخت منتظم گشت. این چند بیت از دست،

اس کے بعد طالب کے چند اشعار نقل کئے ہین، جو آگے مناسب موقع پر درج کئے جاچکے (ہیں) / کئے جا ئین

جہانگیر کے دربار مین اس نے اخیر زندگی تک نہایت عزت و احترام سے بسر کی

عرف ایک موقع پر ایسا پیش آیا کہ کسی بات پر جہانگیر ناراض ہوگیا، اور طالب چند روز

تک شرفِ حضور سے محروم رہا، ایک قصیدہ مین اس واقعہ کو نہایت لطیف پیرایہ

مین ادا کیا ہے،

بہ نسبت گہرم دادہ بود می از کف خویش — ترا از جود زیانے چنین ہزار افتاد

مجھ کو موتی سمجھ کر تو نے پھینک دیا تھا — سخاوت کی وجہ سے تم نے ایسے نقصان بہت اٹھائے ہین

چو رہ شدم ز کفت چرخم از ہوا بربود — بہ گرمی کہ زبانم بزینہار افتاد

جب تو نے مجھ کو پھینک دیا تو آسمان نے اٹھا لیا — اس گرمجوشی کے ساتھ کہ خود مین پناہ مانگنے لگا

یکے مقابل خورشید داشت آئینہ ام — بدید کز عرق موج بر عذار افتاد

تھوڑی دیر تک آسمان نے میرے آئینہ کو آفتاب کے سامنے رکھا — اور دیکھا کہ آفتاب کے چہرے پر پسینہ آگیا

چو پیش مشعل مہ بردشب چراغ مرا — بچہرہ گونہ کاہیش شمع دار افتاد

پھر چاند کے مشعل کے سامنے کیا — اس کا چہرہ شمع کی طرح زرد پڑگیا

ازیں نشاط گرہ دستِ آسماں لرزید — کہ باز در کف خاقانِ کامگار افتاد

اس خوشی سے آسمان کا ہاتھ کانپا — اور دوبارہ میں بادشاہ کے ہاتھ میں آکر گرا

کنوں برشتۂ مہرش بدار کز تقدیر — دوبارہ در کف ایں در شاہوار افتاد

اے بادشاہ! اب مجھ کو محبت کی لڑی میں پرو لے — کیونکہ دو دفعہ یہ موتی تیرے ہاتھ سے گر چکا

طالب نے ۱۰۳۶ء میں، یعنی جہانگیر کے مرنے سے ایک برس پہلے عین شباب میں وفات پائی،

اعزہ و اولاد | طالب کی ایک بہن تھی، جس کا نام ستی النسا تھا، جس کو طالب ماں کی جگہ سمجھتا تھا، اس کو طالب کے ساتھ اس قدر محبت تھی کہ صرف اس سے ملنے کے لئے ایران سے آگرہ میں آئی، طالب اس وقت جہانگیر کے ساتھ دورہ میں تھا، بہن سے ملنے کے لئے اجازت طلب کی اور یہ قطعہ لکھ کر پیش کیا،

صاحبا ذرہ پرورا عرضے	بزبانِ سخن در است مرا
پیر ہمشیرہ ایست غم خوارم	کہ بجای جہر مادر است مرا
چار دہ سال بلکہ بیش گذشت	کز نظر دور منظراست مرا
دور گشتم ز خدمتش بعراق	زین گنہ جرم منکراست مرا
ہو نیاورد تابِ دوری من	کہ بہ مادر برابراست مرا
آمد اینک بہ آگرہ وزشوقش	دل طپاں چون کبوتراست مرا
می کشد دل بسوی او آہنگ	چہ کنم شوق رہبر است مرا
گر شود رخصتِ زیارت او	بہ جہانے برابر است مرا

اس کی شادی نصیرا کاشی سے ہوئی تھی، جو مرزا صائب کے استاد مسیح کاشی کا حقیقی بھائی تھا، نصیرا کی وفات کے بعد، ستی النسار ممتاز محل (زوجۂ شاہجہان) کی پیش خدمت مقرر ہوئی، چونکہ نہایت قابل، خوش تقریر، اور خانہ داری کا خاص سلیقہ رکھتی تھی، اس کے ساتھ علم طب میں اس کو مہارت تھی، ممتاز محل نے اس کو مہرداری کی خدمت سپرد کی، فارسیت اور فن قرات کی واقفیت کی وجہ سے جہان آرا بیگم کی تعلیم بھی اس کے متعلق

کی گئی، ممتاز محل کے مرنے کے بعد شاہجہان نے اس کو حرم شاہی کا صدر کل یعنی مدار المہام مقرر کر دیا،

طالب کے اولاد ذکور نہ تھی، دو لڑکیان تھین، ستی النسانے ماں کی حیثیت سے پالا، بڑی کی شادی عاقل خان اور چھوٹی کی، ضیاء الدین خان سے کی، ستی النسا چھوٹی لڑکی کو بہت چاہتی تھی، سنہ ۲۰ جلوس مطابق ۱۰۵۶ھ شاہجہانی مین اس نے بمقام لاہور وفات پائی ستی النسا اس کے ماتم مین سوگ نشین ہوئی، شاہجہان نے خود اس کے پاس جاکر ماتم پرسی کی اور محل مین ساتھ لایا، لیکن ستی النسا کو ایسا سخت صدمہ پہنچا تھا کہ حرم سے واپس آکر اسی دن مر گئی، شاہجہان نے دس ہزار روپیہ تجہیز و تکفین کے لئے عطا کئے، اور حکم دیا کہ لاش محفوظ رکھی جائے، تاج محل کی قبر کے پچھم جانب جلوخانہ سے متصل تیس ہزار روپیہ کی لاگت سے مقبرہ کی تیاری کا حکم دیا، جو سال بھر مین بن کر تیار ہوا، چنانچہ ایک سال کے بعد لاہور سے لاش منگوا کر مقبرہ مین دفن کی اور مقبرہ کے اخراجات کے لئے ایک گاؤن عطا کیا جس کی سالانہ آمدنی تیس ہزار روپیہ تھی،[1]

تیموریون کی یہی شاہانہ قدردانیان تھین جنھون نے ان کے آستانے کو دنیا کے اہلِ کمال کا قبلۂ حاجت بنا دیا تھا،

عام حالات اور اخلاق و عادات

عبد النبی فخر الزمانی جو تذکرۂ میکدہ کا مصنف اور طالب آملی کا معاصر تھا اس کے حالات مین لکھتا ہے،

آن طبیل دستان سرا اور ہمان سال کہ ۱۰۲۰ھ بود بدار الخلافت آگرہ آمد،

این ضعیف را مرتبۂ اوّل در ہندوران ایام باد ملاقات واقع شد، جدائی دید . . . .

---

[1] یہ پوری تفصیل مآثر الامرا جلد دوم ص ۹۱، و ص ۹۲ مین ہے،

بہ انواعِ ہنر آراستہ، چنان خلیق و زود آشنا کہ درین فن نیز عدیل ندا ست، در مثنوی خویش خویش دو سہ بیت در دوست آشنائی خود بیان فرمودہ حقا کہ عالی و دست و داد تکلف نہ کردہ، آن ابیات این ست،،

کتب طے کردہ ام در دوستداری — یکے علامہ ام در علم یاری

سزد آنان کہ علم مہر دارند — درین فنم وحید الدہر خوانند

بنا شد بیوفائی در بساطم — وفا یک گل بود از اختلاطم

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طالب نہایت دوست پرور، وفا شعار اور خوش اخلاق تھا، زمانہ کی ضرورتون نے اگرچہ اس سے در در کی خاک چھنوائی، یہانتک کہ شیدا نے اسکی ہجو مین کہا:

شب و روز محذو منا طالبا — پے جیفۂ دنیوی در تگ است

مگر قولِ پیغمبرش یاد نیست — کہ دنیا است مردار طالب سگ است[1]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرۃً غیور اور خود دار تھا، غازی خان کے دربار مین پہونچ کر اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ پھر کسی کے آگے کبھی ہاتھ نہ پھیلائیگا، لیکن اس کی بدقسمتی تھی کہ غازی خان جوانا مرگ ہوگیا،

عبد اللہ خان ناظم گجرات نے اس کی قدردانی مین کمی نہین کی، لیکن صحبت بے میل تھی، عبد اللہ خان کو شعر و شاعری سے کچھ لگاؤ نہ تھا، اس لئے وہ طالب کی سرپرستی لازمۂ امارت کی حیثیت سے کرتا تھا، اور طالب اس کو پسند نہین کرتا تھا، اعتماد الدولہ نے خود اس کو جہانگیر کے دربار مین پہنچایا، اور بہت سے تکلفات کرکے آب وہ اصلی مرکز پر آیا،

طالب نے ہر موقع پر اپنی آن قائم رکھی، اعتماد الدولہ کے نام اس نے ایک منظوم خط لکھا ہے، اس مین لکھتا ہے کہ شاعری دو قسم کے لوگ اختیار کرتے ہین، ایک وہ پست ہمت،

[1] الدنیا جیفۃ و طالبہا کلاب کی طرف اشارہ ہے۔

جو پیشہ کی حیثیت سے اس کام کو کرتے ہین، دوسرے وہ عالی طبع جن کو فطرۃً خدا نے شاعر بنایا ہے،

دو صنف اند اہل طبیعت کہ ہر یک ندارند باہم سرِ سازگاری

یکے را فرومایگی کرد شاعر یکے را بزرگی و عالی تباری

یکے اضطراری است ابتدائے نظمش یکے راست شغلِ سخن اختیاری

یکے را علوِّ طبیعت بجائے کہ ورزد و سر از سایۂ تاجداری

یکے آن چنان پست فطرت کہ بالد بخود از خطابِ فصاحت شعاری

یکے را طمع گشتہ ہادی این راہ یکے را جوانی و ہنگامہ داری

ان دونون قسمون کی تفصیل لکھ کر پوچھتا ہے،

گدا شاعر و میرزا شاعری ہست ندانم مرا بر چہ ہنجار داری

یعنی دو قسم کے شاعر ہوتے ہین "گدا" اور "میرزا"، فرمائیے، آپ مجھ کو کس قسم مین شمار کرتے ہین؟ پھر خود جواب دیتا ہے،

من از شاعری شکر للہ کہ دارم بہ بختِ بلند تو امیدواری

کہ گر در ہر یک دانہ یاقوت گردد درو بینم از چشمِ بے اعتباری

بہ گلزارِ معنے ہزار فصیحم بہ منصب چہ شد نیستم گر ہزاری

ز آزادگانم تعلق ندانم مرا نیست با اہلِ شیوہ کاری

جہانگیر نے ایک دفعہ نشہ کے ترنگ مین حکم دیدیا تھا کہ مقربانِ خاص داڑھی ترشوا کر شریکِ صحبت ہون۔ طالب نے اس حکم کی تعمیل سے سرتابی کی اور گھر مین بیٹھ رہا، پھر ایک قطعہ لکھ کر بھیجا، جس مین غیر حاضری کی یہ معذرت کی،

تراشید گانند یک سر سپاه — کسے را چو من تبرہ پر کاہ نیست

بہ بزمے کہ موئے نہ گنجد درو — شدن با دو گز ریش دلخواہ نیست

بہشت است بزم تو و در بہشت — من ناتراشیدہ را راہ نیست

یعنی ایسی محفل مین جہان ایک بال کی گنجایش نہین، دو گز کی داڑھی لیکر جانا کچھ اچھا نہین معلوم ہوتا، آپ کی محفل بہشت ہے، اور بہشت مین مجھ ناتراشیدہ کا گذر نہین ہو سکتا، پھر ایک اور قطعہ لکھا،

سفر می کنم صاحبا[1] در نہ من — چہ سر در نہ گردن تراشید می

بناخن نہ از تیغ، از روی خویش — من این مشت بسوزن تراشید می

سر و ریش دا برو و بروت و مژہ — برسم برہمن تراشید می

بر آن کو تراشید پیش از ہمہ — از و بیشتر من تراشید می

چو من راہیم خارج از رسم تو — کہ مو وقت رفتن تراشید می

منشی فیروز ۱۰۲۹ھ مین طالب سے ملا تھا، اس نے ملاقات کے جو واقعات لکھے ہین ان سے طالب کی طرز زندگی کی دلچسپ باتین معلوم ہوتی ہین، اس لیئے ہم اس کا خلاصہ لکھتے ہین۔

"۱۰۲۹ھ مین جب بادشاہ فتح پور مین آیا تو مجھ کو طالب کی ملاقات کا شوق

[1] مولوی غلام علی آزاد نے خزانہ عامرہ مین لکھا ہو کہ اکبر نے ہندون کی طرح آتش پرستی اور ریش تراشی اختیار کر لی تھی، جہانگیر نے بھی باپ کی تقلید کی، اور اسی حیثیت سے طالب کو بھی داڑھی ترشوانے کا حکم دیا لیکن جہان تک ہم کو معلوم ہو، اکبر و جہانگیر کسی عزیز کے مرنے کے وقت داڑھی کا صفایا کراتے تھے جس کو ہندی زبان مین بھدر کہتے ہین، دربار کے خوشامدی بھی اس موقع پر بادشاہ کی تقلید کرتے تھے، طالب کو بھی اسی موقع پر حکم ہوا ہوگا، ورنہ داڑھی ترشوانا تو خود ایرانیون کا عام شعار تھا، جو آج بھی تمام ایران مین جاری ہو، شیعہ لوگ ہندوستان مین بھی خشخشی داڑھی رکھتے ہین، طالب اس سے کیون انکار کرتا،

پیدا ہوا تالاب کے کنارے ایک خیمہ تھا، طالب اس مین مقیم تھا، مین گیا تو دیکھا کہ گویا اعتکاف مین ہے، سامنے دیوان کے اجزا ہین، مصافحہ و معانقہ کے بعد پوچھا کیونکر تشریف لانا ہوا، مین نے کہا آپکے چند شعر سنے تھے، ان کو سنکر ملاقات کا شوق ہوا، پوچھا کیا شعر تھے مین نے یہ شعر پڑھے،

ع لب از گفتن چنان بستم کہ گوئی   ع مژۂ در جہان نمی بینم

جب یہ شعر پڑھا،

مردم ز رشک چند ببینم کہ جام مے   لب بر لبش گذارد و قالب تہی کند

تو اچھل پڑا، اٹھکر گلے لگایا، میرے ذوق سخن کی نہایت تعریف کی، میری کمر مین ہاتھ ڈال کر کہا کمربند کھول ڈالئے اور آرام سے تشریف رکھیے کہ ایک دو دن لطف سے گذرین،

عین اسی حالت مین ایک مغل آگیا جس کے ہاتھ مین خاقانی کا دیوان تھا، اور طالب سے پڑھنا چاہتا تھا، طالب نے کہا آج معاف رکھو مدت کے بعد ایک دوست آشنا ملا ہے، اس سے لطف صحبت اٹھائین گے، لیکن مغل کب مانتا تھا، دیوان کھول کر یہ قصیدہ پڑھنا شروع کیا،

در پردۂ دل آمد دامن کشان خیالش   جان شد خیال بازی در پردۂ وصالش

در مرکز مثلث بگرفتہ ربع مسکون   فریاد اوج مریخ از تیغ مہ صقالش

طالب نے اس شعر کے معنی بیان کئے تو چونکہ علمی استعداد نہ تھی اناپ شناپ باتین کہنی شروع کین، مجکو بے اختیار ہنسی آگئی، طالب نے جھلا کر کہا کہ اس قسم کے اشعار کو تم لوگ ہندوستان مین درس کے قابل سمجھتے ہو، مین ایسے شعر ناخن پا سے

لکھتا ہون، مین نے کہا شاعری اور چیز ہے اور سخن فہمی اور چیز، طالب مکدر ہو کر چپ ہو گیا، مجھ کو بھی ملال ہوا کہ ناحق مین نے اس کا دل دکھایا، اس کے خوش کرنے کو مین نے اور سلسلہ چھیڑ دیا، اور کہا کہ کل دربار مین آپ کے کس شعر پر لوگ معترض تھے، طالب نے کہا یہ شعر تھا،

عنبر افسردہ ام در پردہ دارم بوی خوش

اس پر آصف خان نے اعتراض کیا کہ عنبر کو افسردہ نہین کہہ سکتے، اورون نے بھی اس کی تصدیق کی، مین نے کہا کہ خاقانی نے پتھر کو افسردہ کہا ہے، پھر عنبر نے کیا قصور کیا ہے، خاقانی کا شعر یہ ہے،

کز فیض بدو سنگ فسردہ رسد نما

طالب نہایت خوش ہوا، اور مجھ سے کہا کہ اس شعر کو ایک پرچہ پر لکھ دیجئے،[۱]

شاعری | اس امر مین طالب تمام شعرا سے ممتاز ہے کہ وہ فطرۃً شاعر تھا، یعنی جب نہایت کم سن تھا، اس وقت سے شعر کہتا تھا، ایک قصیدہ جو کلیات مین موجود ہے، اس وقت کا ہے جب تقریباً اسکی عمر ۱۲-۱۳ برس کی تھی، خود اس بات پر فخر کرتا ہے اور کہتا ہے،

غیر کلک من نشان ندہد کسی کز آب شعر | دفتر اسلاف شد یہ کودک دیتی و پرپر

یعنی میرے قلم کے سوا اس کی کوئی مثال نہین مل سکتی کہ کل کا لونڈا اچھلوں کے کاناموں پر پانی پھیر دے،

وہ نہایت جلد شعر کہہ سکتا تھا، اکثر ایسا ہوا ہے کہ اس نے قلم ہاتھ مین لیا اور بے تکلف لکھتا گیا، دو تین گھنٹے مین ۵۰-۶۰ شعر کا قصیدہ تیار ہو گیا، قلیچ خان ناظم لاہور کی شان

[۱] تذکرۂ شعرا از احمد علی سندیلوی ذکر طالب آملی،

مین ۸۴ شعرون کا قصیدہ ایک رات مین لکھا چونکہ خود کہتا ہے،

منم کہ نیست چو من شاعرے ز اہلِ سخن | منم کہ نیست چو من قائلے ز اہلِ کلام
گواہ این دو سہ معنی، ہمین قصیدہ بس است | کہ یافت از سرِ شب تا سپیدہ دم اتمام

جہانگیر کی مدح مین اس کا ایک بڑا پر زور قصیدہ ہے، جس مین ۵۰۔۶۰ شعر ہین،

چو شہسوار مرا چشم بر شکار افتاد | ز زخم تیر نگہ، صید بے شمار افتاد

یہ بھی صرف رات بھر کی کمائی ہے، چنانچہ خود کہتا ہے،

بہ نظام دیستم اے شہریار خردہ مگیر | کہ یک شب این ہمہ نقشم بروئے کار افتاد

پہلی دفعہ جہانگیر کے دربار مین ناکامی کے بعد جو قطعہ دیانت خان کو لکھا تھا، وہ بھی
بالکل قلم برداشتہ تھا، خود کہتا ہے،

ازین قیاس نما غور کن کہ قدرت کیست | بیک دو لحظہ چنین قطعۂ ادا کردن

شاعری طالب کا امتیازی وصف صرف دو چیزین ہین، ندرتِ تشبیہ، لطفِ استعارہ
استعارات کی نزاکت اس کے دور سے پہلے شروع ہو چکی تھی، لیکن اس نے اور زیادہ لطافت
اور ندرت پیدا کر دی، اس کا کلام کہین سے اٹھا کر دیکھو، ہر جگہ نئے نئے استعارات نظر آئینگے،
ان مین سے اکثر لطیف اور نازک ہین، اور بعض بعض معما سازی اور چھوٹے طلسم ہین،

اس موقع پر ہم اس کے چند منتخب اشعار درج کرتے ہین، ان مین ابتدا کے چار شعر وہ
ہین جو جہانگیر نے تزک جہانگیری مین ملک الشعرائی کے خطاب دینے کے وقت انتخاباً درج
کئے ہین، باقی مرزا صائب کے انتخاب ہین،

لب از گفتن چنان بستم کہ گوئی | دہن بر چہرہ زخمے بود بہ شد
عشق در ازل و آخر ہمہ نہ جا است و سماع | این شرابے ست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است

دو لب خواهم یکی در مے پرستی — یکی در عذر خواهی هاے مستی

ز غارت چمنت بر بهار منت هاست — که گل بدست تو از شاخ تازه‌تر ماند

دشنامِ خلق راند هم جزو عا جواب — ابرم که تلخ گیرم و شیرین عوض دهم

بے نیاز از نه زار بابِ کرم می گذرم — چون سیه چشم که بر سرمه فروشان گذرد

مرد بے برگ و نوا را سبک از جاے بگیر — کوزه بے دسته چو بینی بدو دستش بردار

مزهٔ در جهان نمے بینم — دهر گوئی دهان بیمار است

نظارهٔ تو او جهان جز دو چشم نیست — یکی چشم باز مانده و یک چشم بر هم است

خانه شرع خراب است که ارباب صلاح — در عمارت گری گنبد دستار خودند

ما را زبانِ شکوه ز بیداد چرخ نیست — از ما خطے بمهر خموشی گرفته اند

درین انجمن غیر لبهاے یار — دو مے را بیک نشه کم دیده‌ام

با صد کرشمه آن بتِ بد مست می رود — خود می کند خرام و خود از دست می رود

میرزا صائب اصفہانی
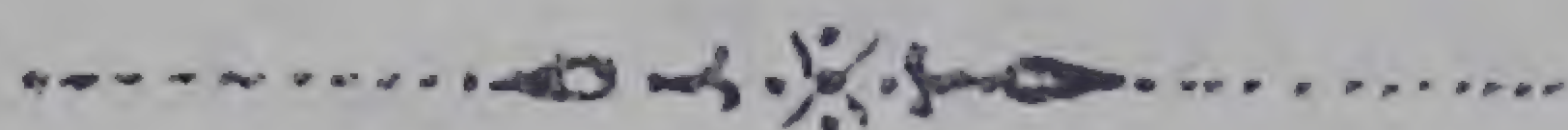
ایران کی شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور میرزا صائب پر ختم ہو گئی، رودکی سے پہلے بھی شعرا گذرے ہین، اور میرزا صائب کے بعد بھی لوگون نے طبع آزمائیان کین، لیکن یہ دونون دور شمار کے قابل نہین، اخیر دور مین قاآنی بے شبہہ ایسا شخص پیدا ہوا جس نے دفعۃً شاعری کی کایا پلٹ کر دی، لیکن اس کی شاعری، کوئی نئی شاعری نہین بلکہ اس نے سات سو برس کے بھولے ہوئے خواب کو یاد دلایا، اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ فرخی اور منوچہری نے قاآنی کا قالب اختیار کر لیا،

شاعری ابتدا سے جس انداز پر چلی آتی تھی، اکبری اور صفوی دور نے دفعۃً اس کی روش بدل دی، عرفی، نظیری، وحشی یزدی، شفائی نے ہزارون گوناگون خیالات پیدا کر کے شاعری کے میدان کو نہایت وسیع کر دیا، بالخصوص عشق و عاشقی کے رموز و اسرار، اور فلسفۂ زندگی کے ایسے سیکڑون ہزارون نکتے بیان کئے، جو قدما کے خواب و خیال مین بھی نہ آئے تھے، لیکن یہ جو کچھ تھا اکبر و عباس صفوی کا فیض تھا، جہانگیر و شاہجہان نے شاہانہ فیاضیان اکبر سے بھی زیادہ دکھائین، لیکن تمام پر زور قوتین کام مین آچکی تھین، جہانگیر اور شاہجہان کے لئے فطرت کی فیاضی کا بہت کم سرمایہ رہ گیا تھا، اس عہد مین بھی جو کچھ مواد اکبر ہی کی تحریک و امداد قوت تھی، قدسی، طالب آملی، طالب کلیم گو جہانگیری شاہجہانی شعرا ہین لیکن یہ بھی اکبر ہی کے نہال فیض کے برگ و بار ہین،

میرزا صائب بھی اسی عہد کے یادگار ہین، اور سچ یہ ہے کہ کلیم کے سوا اس دور مین کوئی شخص ان کی ہمسری کا دعویٰ نہین کر سکتا، اور اس کے بعد تو عالمگیر کے زہد خشک نے شاعری کا چراغ ہی گل کر دیا،

صائب ایک معزز خاندان کا آدمی تھا، اس کا باپ مشہور تاجر تھا، اس کی ولادت تبریز مین ہوئی[1] لیکن نشو ونما اور تعلیم و تربیت اصفہان مین حاصل کی، اسی بنا پر اس کو تبریزی اور اصفہانی دونون کہتے ہین، شعر و شاعری سے اس کو قدرتی مناسبت تھی، آغاز سن شعور مین جب اس کی شاعری کے چرچے ہونے لگے تو ایک شخص نے امتحان کے طور پر ایک مہمل مصرع پیش کیا کہ اس پر مصرع لگا دیجئے، مصرع یہ تھا،

شمع گر خاموش باشد آتش از مینا گرفت

صائب نے پیش مصرع کہہ کر مصرع کو بامعنی کر دیا،

امشب از ساقی ز بس گرمست محفل میتوان	شمع گر خاموش باشد آتش از مینا گرفت

یعنی آج محفل ایسی گرم ہے کہ اگر شمع بجھ جائے تو بوتل سے آگ روشن کر لیجا سکتی ہے،

باوجود شاعری کے صائب پر مذہبی خیالات بہت غالب تھے، آغاز شباب مین حج کا سفر کیا، واپسی کے بعد مشہد مبارک کی زیارت کی، اور اظہار عقیدت کے طور پر ایک قصیدہ لکھا جس کا ایک شعر یہ تھا،

للہ الحمد کہ بعد از سفر حج صائب	عہد خود تازہ بسلطان خراسان کردم

صائب نے شاعری کی باقاعدہ تعلیم، حکیم رکنا مسیح کاشی، اور حکیم شفائی سے حاصل کی

[1] آتشکدہ مین لکھا ہے کہ اس کے خاندان کو عباس صفوی نے اصفہان مین لیجا کر آباد کرایا تھا، اور صائب وہین پیدا ہوا ۱۰۲ مدیصا،

حکیم رکنا مشہور شاعر گذرا ہے، شاہ عباس صفوی اس کے گھر پر اس سے ملنے آتا تھا، شاہ عباس کو حاسدون نے اس کی طرف سے رنجیدہ کر دیا، تو حکیم رکنا نے دربار سے قطعِ تعلق کیا، اور یہ مطلع لکھا،

گر فلک یک صبحدم با من گران باشد سرش　　شام بیرون میروم چون آفتاب از کشورش

اس کے بعد ہندوستان چلا آیا اور اکبر و جہانگیر کے دربار مین رسائی پائی، شاہجہان جب تخت پر بیٹھا تو قطعۂ تاریخ لکھ کر بارہ ہزار روپیہ صلے مین حاصل کیے، سنہ ۱۰۴۱ھ مین مشہد مقدس کی زیارت کی اجازت لی، شاہجہان نے زادِ سفر کے لیے پانچہزار روپئے عنایت کیے، سنہ ۱۰۶۶ھ مین انتقال کیا،

ہندوستان کی فیاضیون کے غلغلہ سے تمام ایران گونج رہا تھا، صائب کے دل مین بھی تحریک پیدا ہوئی، چنانچہ خود کہتا ہے،

ہمچو عزمِ سفرِ ہند، کہ در ہر دل ہست　　رقص سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

زادِ سفر کے لیے اگرچہ شاعری سے بہتر کوئی چیز نہ تھی، لیکن صائب چونکہ ایک معزز تاجر کے گھر مین پیدا ہوا تھا، اس نے یہ مبتذل طریقہ پسند نہ کیا، اور تجارت کے ذریعہ سے دلی مین آیا، شاہجہان کے دربار مین رسائی حاصل کی اور ہزاری منصب اور مستعد خان خطاب عطا ہوا، یہین ظفر خان سے ملاقات ہوئی، اور اس قدر تعلقات بڑھے کہ صائب اور ظفر خان کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے[1]،

ظفر خان مشہور امراے تیموری مین سے ہے، اس کا باپ خواجہ ابو الحسن، اکبر کے

[1] صائب کے سفرِ ہندوستان کے متعلق نہایت مختلف و متناقض روایتین ہین، مین نے سروِ آزاد، ید بیضا، ریاض الشعرا کو چھوڑ کر مرآۃ الخیال کی روایت اس لیے اختیار کی ہے کہ اس کا مصنف صائب کا گویا ہمعصر تھا،

زمانے مین ایران سے آکر دکن کا دیوان مقرر ہوا تھا، جہانگیر نے اپنے زمانے مین وزیر اعظم مقرر کیا ۱۰۳۳ھ مین وزارت کے ساتھ کابل کی حکومت بھی عطا کی، لیکن چونکہ وزارت کے تعلق سے پایۂ تخت سے جدا نہین ہو سکتا تھا، اس کے بیٹے ظفر خان کو باپ کی قائم مقامی کے طور پر کابل کی حکومت ملی، ظفر خان نہایت فیاض اور قدردان علم و فن تھا خود بھی شعر کہتا تھا اور احسن تخلص کرتا تھا، مرزا صائب کی شاگردی نے اس کی استعداد کو او ترقی دی، چنانچہ خود کہتا ہے،

طرز یاران، پیش احسن بعد ازین مقبول نیست ۔۔۔ تازہ گوئیہای او، از فیض طبع صائباست

مرزا صائب نے ظفر خان کی مدح مین متعدد قصائد لکھے، اور چونکہ ممدوح درحقیقت مدح وثنا کا سزاوار تھا، میرزا کو اس کی مداحی پر ناز تھا، ایک قصیدہ مین لکھتا ہے،

کلاہ گوشہ بخورشید و ماہ می شکنم ۔۔۔ بدین غرور کہ مدحت گر ظفر خانم

ز نوبہار سخایش چو قطرہ ریزہ شوم ۔۔۔ قسم خورد بسر کلک ابر نیسانم

بلند بخت نہالا! بہار تربیتا! ۔۔۔ کہ از نسیم ہوا دار بیت گلستانم

حقوق تربیتت را کہ در ترقی باد ۔۔۔ زبان کجاست بگوید حضرت فرد خوانم

تو پایۂ تخت سخن را بدست من دادی ۔۔۔ تو تاج مدح نہادی بفرق دیوانم

زمعی گرم تو خورشید خون معنی من ۔۔۔ کشید جذب تو این لعل، از رگ کانم

تو جان ز نقل بجا مصرع مراد دادی ۔۔۔ تو در فصاحت، دادی خطاب سحبانم

ز دقت تو معنی شدم چنان باریک ۔۔۔ کہ می توان بدل مور، کرد پنہانم

چو زلف سنبل ابیات من پریشان بود ۔۔۔ نداشت طرۂ شیرازہ روے دیوانم

تو غنچہ سخنم اوراق بادبردہ من ۔۔۔ دگر نہ خار نمی ماند از گلستانم

ؔلہ ید بیضا و سرو آزاد بلگرامی

ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا صائب نے اپنے دیوان کو ظفر خان کی فرمایش سے مرتب کیا تھا، ان اشعار سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ظفر خان میرزا صائب کے کلام پر استادانہ نکتہ چینیان کرتا تھا، اور اس قسم کی روک ٹوک سے میرزا کا کلام اور زیادہ ترقی کرتا جاتا تھا،

۱۰۳۹ ہجری مین شاہجہان نے دکن کا رخ کیا، ظفر خان بھی اس سفر مین ہمرکاب تھا، اور میرزا صائب اس کے ساتھ تھا، جب برہان پور مین پہنچا تو چونکہ یہان کی زمین نہایت غبار انگیز تھی میرزا صائب نے کہا،

توتیا ساز د غبار آگرہ و لاہور را ۔۔۔ چشم من تا خاک گرد برہانپور خورد

صائب کے باپ کو صائب سے نہایت محبت تھی، اس زمانے مین ہندوستان کا سفر ایک معمولی بات تھی، اور ایران اور ہندوستان ایک مکان کے دو صحن بن گئے تھے، تاہم محبت کا یہ جوش تھا کہ میرزا کے باپ نے ستر برس کی عمر مین ہندوستان کا سفر اختیار کیا اور پیارے بیٹے کو ساتھ لیجانا چاہا، میرزا صائب کو مجبوراً ظفر خان سے رخصت کی استدعا کرنی پڑی، ایک مدحیہ قصیدہ لکھا اور اس مین اس طرح اظہار مطلب کیا،

شش سال بیش رفت کہ از اصفہان بہند ۔۔۔ افتادہ است توسنِ عزم مرا گذار

آوردہ است جذبۂ گستاخ شوقِ من ۔۔۔ از اصفہان بہ آگرہ و لاہورش اشکبار

ہفتاد سالہ، والد پیرست بندہ را ۔۔۔ کز تربیت بود بمنش حقّ بے شمار

زان پیشتر کز آگرہ بہ معمورۂ دکن ۔۔۔ آید عنان گسستہ تر، از سیلِ بے قرار

این راہ دور را ز سر شوق طے کند ۔۔۔ با قامتِ خمیدہ، و با پیکرِ نزار

دارم امید رخصتے، از آستانِ تو ۔۔۔ اے آستانت، کعبۂ امیدِ روزگار

مقصود او ز آمدنش بردنِ من ست ۔۔۔ لب را بحرفِ رخصت من کن گہر نثار

باجہ گشادہ تر از آفتاب صبح ‌ ‌ ‌ ‌ دست دعا بہ بدرقۂ راہ من برآر[1]

حسن اتفاق یہ کہ اسی زمانہ مین یعنی سنہ ۱۰۴۱ ہجری مین شاہجہان نے دکن سے آگرہ کا قصد کیا اور آغاز سنہ ۱۰۴۲ھ مین ظفرخان کشمیر کی صوبہ داری پر ممتاز ہوا، میرزا صائب ظفرخان کے ساتھ کشمیر مین آیا اور اس بہست برین کی سیر کرکے باپ کے ساتھ وطن کو واپس گیا، ایران مین ایسے جوہر قابل کے لئے قدر دانی کی کیا کمی تھی، سلاطین صفویہ نے بڑی عزت و احترام سے لیا، میرزا نے بھی ان کی مدح مین پرزور، قصائد لکھے، شاہ عباس ثانی نے اس کو ملک الشعرا کا خطاب دیا، لیکن جب اس کے بعد سلیمان صفوی تخت نشین ہوا، اور میرزا صائب نے قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جس کا یہ مطلع تھا،

احاطہ کرد خط آن آفتاب تابان را ‌ ‌ ‌ ‌ گرفت خیل پری، درمیان سلیمان را

تو سلیمان صفوی چونکہ نوخیز اور نوخط تھا، نہایت رنجیدہ ہوا، اور پھر تمام عمر میرزا سے خطاب نہ کیا،[2]

میرزا نے اگرچہ اخیر زندگی تک ایران سے قدم باہر نہین نکالا تاہم ہندوستان کی فیاضیان رہ رہ کر یاد آتی تھین، جب نواب جعفرخان آغاز عہد عالمگیری مین وزیر اعظم مقرر ہوا تو میرزا نے یہ شعر لکھ کر بھیجا،

دوردستان را باحسان یاد کردن ہمت ست ‌ ‌ ‌ ‌ ورنہ ہر نخلے بپاے خود ثمر می افگند

جعفرخان نے پانچہزار روپیہ اور بقول بعض پانچہزار اشرفیان بھیجین،[3]

سنہ ۱۰۸۰ ہجری مین بمقام اصفہان وفات پائی "صائب وفات یافت" مادہ تاریخ ہے، میرزا کا ایک مطلع ہے،

---

[1] سرو آزاد [2] ریاض الشعرا، [3] خزانۂ عامرہ،

در ہیچ پردہ نیست نباشد نوائے تو ۔۔۔ عالم پُرست از تو و خالی ست جائے تو

میرزا نے وصیت کی تھی کہ یہ مطلع اس کے مزار پر کندہ کیا جائے، چنانچہ سنگ مرمر کے لوح پر کندہ کیا گیا،

عام حالات و عادات | مرزا نہایت خوددار، پابند وضع، پاکیزہ خو اور منکسر المزاج تھا، شعرائے ایران کی عام عادت ہے کہ ہندوستانی شعرا کو مطلق خاطر مین نہین لاتے، امیر خسرو اور حسن کے سوا کسی ایرانی مستند شاعر نے کبھی کسی ہندوستانی شاعر کا نام نہین لیا، لیکن مرزا صائب اپنے ہمعصر ہندوستانیون کا نام بھی، غزل کے مقطعون مین لاتا ہے، اور ان کی غزلون پر غزل لکھنا گوارا کرتا ہے، ایک غزل غنی کے جواب مین لکھی ہے، اس کا مقطع یہ ہے،

این جواب آن غزل صائب کہ میگوید غنی ۔۔۔ یاد ایامیکہ دیگِ شوق ما سرپوش داشت

میرزا کی عادت ہے کہ اکثر شعرا کی غزلون پر غزل لکھتا ہے اور مقطع مین ان شعرار کی غزلون کے پورے مصرع نقل کر دیتا ہے، اس سے اس کی صحت مذاق اور خوبیِ انتخاب کا اندازہ ہو سکتا ہے،

این آن غزل کہ فیضیِ شیرین کلام گفت ۔۔۔ "در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستۂ"

این جواب آن غزل صائب کہ می گوید ملک ۔۔۔ "چشم بنشین باز کن، تا ہرچہ خواہی بنگری"

بطرز تازہ قسم یاد می کنم صائب ۔۔۔ کہ جائے طالب آمل در اصفہان پیداست

این جواب مصرع نوعی کہ خاکش سبز باد ۔۔۔ "سایۂ ابر بہاری کشت را سیراب کرد"

این آن غزل کہ اوحدیِ خوش کلام گفت ۔۔۔ "اے روشن از رخِ تو زمین و زمان ہمہ"

جواب آن غزل ست اینکہ میر شوقی گفت ۔۔۔ "چو شعر از دو طرف می کشند زنجیرم"

این جواب آن غزلِ صائب کہ فیضی گفتہ است ۔۔۔ "از فراموشان مباد آنکس کہ ما را یاد کرد"

صائب این تازہ غزل آن غزل شاپور ست | کہ گران می رود آن کس کہ توکل دارد"
جواب آن غزل است انکیہ گفتہ است مطبع | "کلید کعبہ و بیت خانہ در بغل دارم"
این جواب مصرع اوجی کہ وقتی گفتہ است | "بادشاہی عالم طفلی ست یا دیوانگی"
این جواب آن غزل صائب کہ وہم گفتہ است | "گر نش دامن نگیرم تو ن من خود مردہ نیست"
جواب این غزل حاذق ست این صائب | "بہار دیدم و گل دیدم و خزان دیدم"
این جواب ان غزل صائب کہ قم گفتہ است | "تیغ دانم آب در جو دار دو خون می خورد"

شعرا مین ہمیشہ باہم رقابت اور حسد ہوتی ہے۔ لیکن مرزا صائب اس کو نہایت ناپسند کرتا تھا
چنانچہ ایک نظم مین باہمی محبت اور اعانت کی ترغیب دی ہے[1]۔

خوش آن گروہ کہ مست بیان یکدگراند | زجوش فکر مے ارغوان یکدگراند
نمی زنند بسنگ شکست گوہر ہم | پے رواج متاع دکان یکدگراند
زنند بر سر ہم گل ز مصرع رنگین | ز فکر تازہ، گل بوستان یکدگراند
سخن تراش چو گردند تیغ الماسند | زند چو طبع بکندی فسانہ یک دگرند
بغیر صائب و معصوم نکتہ سنج و کلیم | دگر کہ ز اہل سخن مہربان یکدگراند

صائب اگرچہ تمام اساتذہ بلکہ ہمعصرون تک کو ادب سے یاد کرتا تھا، لیکن خاص اساتذہ کا
نہایت معتقد تھا، سب سے زیادہ خواجہ حافظ کا معترف تھا، اور یہ اس کی صحیح المذاقی کی بہت
بڑی دلیل ہے، لوگون کے اصرار سے ایک غزل خواجہ حافظ کی غزل پر لکھی ہے مقطع مین یہ عذر کیا

صائب بہ تو بون کرد بہ تکلیف عزیزان | ورنہ طرف خواجہ شدن بے بصری تو

ایک اور غزل مین کہتا ہے

[1] سرو آزاد، ذکر معصوم شاعر۔

روداست صائب اگر نیست از رہِ دعویٰ　　　تتبعِ غزلِ خواجہ گرچہ بے ادبی ست

حکیم رکنا اور شفائی کا شاگرد تھا، اس لئے ان دونوں کا نام نہایت ادب سے لیتا ہے،

این آن غزل حضرت رکنا ست کہ فرمود　　　"پائے ملخے پیشِ سلیمان چہ نماید"

در اصفہان کہ بدردِ سخن رسد صائب!　　　کنون کہ نبض شناسِ سخن شفائی نیست

نظیری کو عرفی سے زیادہ مانتا تھا، چنانچہ کہتا ہے،

صائب چہ خیال ست شوی ہمچو نظیری　　　عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

یہان تک مضائقہ نہین، لیکن افسوس ہے کہ عام خوش اعتقادی یا شہرت عام

کی بنا پر ظہوری اور جلال اسیر کی بھی مداحی کرتا ہے،

صائب نداشتیم سر و برگ این غزل　　　این فیض از کلامِ ظہوری بما رسید

خوشا کسی کہ چو صائب ز صاحبان کمال　　　تتبعِ غزلِ میرزا جلال کند

بدمذاقی کا یہ پہلا قدم تھا، جس نے آخر ایک شاہراہ قائم کردی، اور نوبت یہ پہنچی کہ آج

لوگ ناصر علی، بیدل، شوکت بخاری وغیرہ کے کلام پر سر دھنتے ہین "بنای ظلم در جہان

اندک بود، ہر کہ آمد بران مزید کردہ"

میرزا صائب نے ہر قسم کی اصناف سخن مین طبع آزمائی کی ہے، قصائد متعدد ہین، ایک چھوٹی سی

رزمیہ مثنوی بھی ہے، اور غزل تو اس کا خاص فن ہے، لیکن قصائد اور مثنویان کم رتبہ ہین،

یہ دونون چیزین اس دور سے پہلے ابتر ہوچکی تھین، اور مرزا بھی اس کی کچھ تلافی نہ کرسکا، رزمیہ

مثنوی کا ایک شعر یاد رکھنے کے قابل ہے،

چنان لرزہ در دشت کین اوفتاد　　　کہ قارون برون از زمین اوفتاد

میرزا نہایت پرگو، اور بدیہہ گو تھا، جس زمانے مین وہ برہان پور دکن مین تھا، ایک قصیدہ

ساٹھ شعرون کا صرف دو پہر مین لکھا، اس قادر الکلامی کے نشہ مین خود کہتا ہے،

هزار حیف که عرفی و نوعی و سنجر | نیند جمع بدار العیار برہان پور
که قوت سخن و لطفِ طبع می دیدند | نمی شدند بطبعِ بلند خود مغرور
ہمین قصیده که یک چاشت ز دے داد مرا | ز اہلِ نظم که گفت ست؟ در سنین و شهور

ایک دفعہ اس کے ایک شاگرد نے ایک مہمل مصرع پیش کیا کہ اس پر مصرع لگا دیجئے مصرع یہ تھا، ع

از شیشۂ بے مے مئے بے شیشہ طلب کن

صائب نے فوراً کہا

حق را ز دلِ خالی از اندیشہ طلب کن

ایک دفعہ راہ مین چلا جا رہا تھا، ایک کتے کو بیٹھا ہوا دیکھا، چونکہ کتا جب بیٹھتا ہے، تو گردن اونچی کرکے بیٹھتا ہے۔ فوراً یہ مضمون خیال مین آیا[1]

سگ نشستہ ز استادہ سر فراز تر ست | شود ز گوشہ نشینی فزون رعونتِ نفس

فغانی کا مشہور مطلع ہے،

به بوے صبحدم، نالان بگلگشتِ چمن رفتم | نهادم روے بر روے گل و از خویشتن رفتم

میرزا نے اس کو یون بدل دیا،[2]

ببوے صبحدم گریان چو شبنم در چمن رفتم | نهادم روے بر روے گل و از خویشتن رفتم

شبنم کی تشبیہ نے شعر مین جان ڈال دی اور دعوے کو پورا ثابت کر دیا،

میرزا خاضع، میرزا صائب کے شاگرد اور سید عبد الجلیل بلگرامی کے ہمنشین تھے، ان کی

---

[1] کلمات الشعرا، سرخوش [2] ایضاً

زبانی منقول ہے کہ ایک دفعہ مین نے میرزا صائب کے سامنے یہ مصرع پڑھا، ع

دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن

مصرع بالکل مہمل تھا، یعنی چند چیزین بے مناسبت جمع کردی تھین، میرزا نے پیش مصرع لگا کر عجیب فلسفیانہ مضمون پیدا کر دیا[1]،

بقدر ہر سکون راحت بود، بنگر تفاوت را　　　دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مردن

میرزا کی زندگی ہی مین اس کے کلام کو یہ حسنِ قبول حاصل ہو چکا تھا کہ سلاطین اور امرا، شاہ ایران سے اس کے کلام کی استدعا کرتے تھے اور تحفہ اور سوغات کی طرح اس کی غزلین بھیجی جاتی تھین[2]،

میرزا نے فن سخن کے متعلق ایک بڑا کام یہ کیا کہ قدما اور متاخرین کا کلام انتخاب کر کے ایک بیاض مرتب کی جو سخندانون کے لیے دلیل راہ کا کام دیتی ہے، میرزا کا اپنا انداز گو خاص ہے اور وہ شاعری کا معمولی درجہ ہے، لیکن چونکہ اس کا مذاق نہایت صحیح تھا، اس لیے بلند اور نادر اشعار انتخاب کیے ہین، شعرائے عرب مین ابو تمام ایک مشہور شاعر گذرا ہے جو متنبی کا ہم پلہ خیال کیا جاتا ہے، اس نے ایک مجموعہ انتخاب کیا تھا جو حماسہ کے نام سے مشہور ہے، اور فن ادب کی جان ہے، اہلِ فن کا بیان ہے کہ ابو تمام کی شاعری کا کمال جس قدر اس انتخاب سے معلوم ہوتا ہے، خود اس کے دیوان سے ظاہر نہین ہوتا،

میرزا صائب کے انتخاب کا بھی بعینہ یہی حال ہے، جس شاعر کے جتنے اشعار انتخاب کر دیئے ہین، وہی اس کے تمام دیوان کا عطر ہے،

مین نے اس کتاب کا ایک نسخہ حیدر آباد مین دیکھا تھا، جو خود میرزا کے ایک شوقین

---

[1] ید بیضا، [2] کلمات الشعرا سرخوش،

شاگردنے ایران مین نہایت اہتمام سے طیار کرایا تھا، ہر شاعر کے نام کے ساتھ اس کے اشعار کی تعداد بھی ہندسون مین لکھدی ہے۔ اخیر مین مختصر سی عبارت ہے، جس مین انتخاب کا حال لکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اہل فن اس بیاض کی نقلین لیتے تھے، اور اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، والہ داغستانی نے ریاض الشعرا مین جابجا اس کے حوالے دئے ہین، مین نے اس بیاض کے تین نسخے دیکھے ہین، جن مین سے ایک خود میرے کتب خانے مین موجود ہے،

میرزا کے لطائف وظرائف بہت مشہور ہین، جس زمانے مین وہ کشمیر مین تھا، ایک دن ظفرخان کے دربار مین اشعار پڑھ رہا تھا، اور ہر طرف سے تحسین و آفرین کی صدا بلند تھی، ایک نوخیز نے حسد سے کہا کہ یہ تمام مضامین قدما کے یہان بندھ چکے ہین، موجودہ شاعرون کا یہ کام رہ گیا ہے کہ صرف لفظون کو الٹ پلٹ کر دیتے ہین، صائب نے برجستہ کہا،

اہلِ دانش، جملہ مضمون ہاے نگین بستہ اند ۔۔۔۔ ہست مضمون نہ بستہ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ شما

چونکہ اتفاقاً شعر حسب حال تھا، ظفرخان بے اختیار ہنس پڑا اور میرزا کو انعام دیا،

میرزا نے ایک غزل لکھی تھی، جس کا مطلع تھا،

ہر دمن طرح تو انداختہ یعنی چہ ۔۔۔۔ جامہ را فاختہ ہر ساختہ یعنی چہ

ایک مولوی صاحب نے سنا تو فرمایا کہ ردیف غلط ہے، یعنی چہ غائب کا صیغہ ہے، اور مخاطب کے لئے استعمال کیا گیا ہے، میرزا کے سامنے کسی نے تذکرہ کیا، اس نے کہا، شعر مرا بمدرسہ کہ برد،

ایک صاحب محمد مراد متخلص بہ لائق جون پور کے رہنے والے تھے، عالمگیر کے زمانے مین لاہور کی سوانح نگاری پر مامور تھے، آغاز شباب مین ان کو شاعری کا شوق پیدا ہوا، میرزا صائب کی شہرت سن کر ایران کا قصد کیا، اور جوشِ اعتقاد

مین جون پور سے اصفہان تک پاپیادہ گئے، میرزا نے بھی ان کے خلوص وارادت کی بڑی قدر کی، خود اپنے گھر مین مہمان اتارا اور ہر طرح کی مہمان نوازی کی، ان کا بیان ہے کہ مین نے کبھی مرزا کو شعر کے لئے غور و فکر کرتے نہین دیکھا، لیکن ایک دن خلاف عادت باغ کی روشون پر متفکرانہ ٹہل رہے تھے، مین نے سبب پوچھا، فرمایا کہ فردوسی کا مشہور شعر ہے،

بفر موو نار خش را زین کنند ۔۔۔ درم اند روم نائے زرین کنند

شفائی نے اس شعر کا جواب لکھا ہے،

بفر مود تا زین برابرش نہند ۔۔۔ چہ زین ہمہ بالائے انش نہند

مین بھی اس کا جواب لکھنا چاہتا ہون، انھون نے کہا کہ اجازت ہو تو مین اس کام کو انجام دون، تمام رات کی غور و فکر کے بعد صبح کو یہ شعر لکھ کر میرزا کی خدمت مین پیش کیا[1]،

بفر مود تا زین بر آذ ہمہ نہند ۔۔۔ بہ پشت صبا مسند جم نہند

میرزا نے بہت تعریف کی، یہ واقعہ غلام علی آزاد نے ید بیضا مین خود لائق جونپوری کی زبان سے نقل کیا ہے، لیکن قیاس مین نہین آتا کہ صائب شفائی کے شعر کو فردوسی کے مقابلہ مین لائے، اور پھر خود جواب لکھنے کا ارادہ کرے،

کلام پر راے۔ میرزا صائب کا خاص انداز تمثیل ہے۔ تمثیل کا طریقہ پہلے بھی تھا، لیکن صائب نے اس کثرت سے اس کو برتا کہ اس کی خاص چیز ہو گئی، اس کے علاوہ اور شعراء عام مضامین مین تمثیل سے کام لیتے تھے، صائب نے اخلاقی مضامین کے لئے خاص کر دیا،

جا بجا خیال بندی اور مضمون آفرینی بھی پائی جاتی تھی، اور یہ خاص متاخرین کا انداز ہے، اگرچہ صائب کے ہان وہ لطیف خیالات اور عشق و محبت کے اسرار نہین

[1] ید بیضاء

پائے جاتے جو عرفی و نظیری کے ہان نہایت کثرت سے پائے جاتے ہین تاہم زبان کی فصاحت ترکیب کی بندش، محاورات کا استعمال ہاتھ سے نہین جانے پاتا، بخلاف اور متاخرین کے جن کے کلام کو پڑھ کر زبان کی خوبیون کی طرف مطلق ذہن متوجہ نہین ہوتا،

اشعار ذیل ملاخطہ ہون،

خود نگر از در انصاف در آئی ورنہ
جذبہ شوق حریفِ دلِ خود کامِ تو نیست

قمریان پاس غلط کردہ خود می دارند
ورنہ یک سرو درین باغ بہ اندامِ تو نیست

یعنی قمریون کو اپنی غلط بات کی پیچ آن پڑی ہے، ورنہ ایک سرو بھی تیرے قد و قامت کا ہمسر نہین،

شب کہ صحبت بحدیث سر زلف تو گذشت
ہر کہ برخاست ز جا سلسلہ برپا برخاست

یادگار جگر سوختہ مجنون ست
لالہ چندے کہ از دامنِ صحرا برخاست

نہ شبنم ست چمن را بروے آتشناک
عرق ز روے تو کردہ است گل بدامن پاک

تو فکر نامۂ خود کن کہ مے پرستان را
سیاہ نامہ نخواہد گذاشت گریۂ تاک

دلم بپاکیِ دامانِ غنچہ می لرزد
کہ بلبلان، ہمہ مستند و باغبان تنہا

چشم عاشق ز تماشاے تو چون سیر شود
ہر نگہ سلسلہ جنبانِ نگاہِ دگر ست

کہ گذشت ست ازین بادیۂ دیگر کامروز
نبض رہ می طپد و سینۂ صحرا گرم ست

طوفانِ گل و جوش بہارش بہ ببیند
اکنون کہ جہان بر سر کار ست بہ بینید

المہ بیخبری طرفہ بہشتے بودہ است
حیف صد حیف کہ ما دیر خبردار شدیم

م این جا صلح کن یا ما چہ لازم
کہ در محشر ز ما شرمندہ باشی

درین دو ہفتہ کہ چون گل درین گلستانی
کشادہ روے تر از رازہاے مستان باش

تمیز نیک و بد روزگار کار تو نیست — چو چشم آئینہ در خوب و زشت حیران باش

درونِ خانۂ خود ہر گدا شہنشاہ است — قدم برون منہ از حدِ خویش سلطان باش

میانِ نور و ظلمت عالمے دارم نمے دانم — کہ شامم صبح یا صبحِ امیدم شام می گردد

این قدر کز تو دلے چند شود شاد بس ست — زندگانی، بمراد ہمہ کس نتوان کرد

صائب کے تمثیلیہ اشعار چونکہ عام طور پر زبانوں پر ہیں، اس لئے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں،

ابوطالب کلیم

ملک الشعراے شاہجہانی

یہ یگانۂ فن صحیفۂ شاعری کا اخیر ورق ہے اور اسی کے نام پر (شعرالعجم حصۂ سوم) کا خاتمہ ہے،
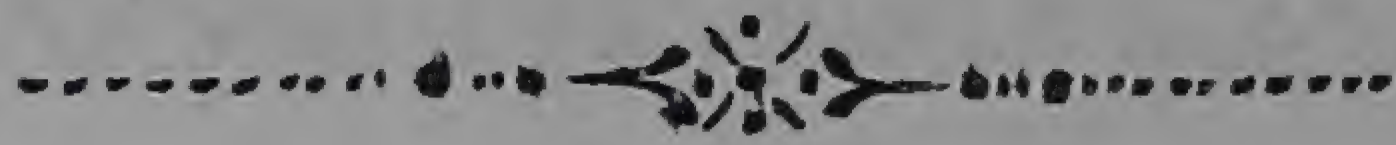
ہمدان مین پیدا ہوا، لیکن کاشان مین زیادہ کام رہا، آغاز جوانی مین شیراز جاکر علوم درسیہ کی تحصیل کی[1]،

جہانگیر کے عہد حکومت مین ہندوستان آیا، امراے جہانگیری مین شاہنواز خان صفوی ابن مرزا رستم صفوی ایک مشہور امیر تھا، عالمگیر اور مرزا شجاع اس کے داماد تھے، کلیم نے اوّل اس کے دربار مین رسائی پیدا کی، لیکن سنہ ۱۰۲۸ ہجری مین وطن کی یاد نے بیچین کیا، اس زمانے کا ہندوستان وہ چیز تھی کہ کلیم گو وطن کو جاتا تھا، لیکن حسرتون کا انبار لیے جاتا تھا، اسی حالت مین غزل لکھی جس کے چند شعر یہ ہین[2]،

زشوقِ ہند زان سان چشم حسرت برقفا دارم   کہ رو ہم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را

ہندوستان کے شوق مین میری آنکھین اس طرح پشت کی طرف لگی ہوئی ہین کہ سامنے کے رخ پر نظر بھی ڈالتا ہون تو سامنے کا آدمی نظر نہین آتا،

اسیر ہندم وزین رفتنِ بیجا پشیمانم   کجا خواہد رساندن پر فشانی مرغ بسمل را

بہ ایران میرود نالان کلیم از شوقِ ہمراہان   بپاے دیگران ہمچون جرس طے کردہ منزل را

---

[1] شاہجہان نامہ جلد ثانی صہ ۳۵۳ [2] خزانۂ عامرہ و سرآزاد،

اس حالت کے ساتھ وطن میں کیا جی لگتا، دو برس بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ پھر ہندوستان واپس آیا، اب کی اس نے میر جملہ شہرستانی کا دامن پکڑا، میر جملہ کو جہانگیر نے دست خاص سے خط لکھ کر اصفہان سے بلایا تھا، چنانچہ ۱۰۲۷ھ ہجری میں باریاب ہوا، اور دو نیم ہزاری کا منصب ملا، شاہجہان کے زمانے میں پنجہزاری تک پہنچا کلیم کی شاعری گا اگرچہ سکہ جمتا جاتا تھا، اس کے سرپرست بھی دربار شاہی میں خاص اعزاز رکھتے تھے، لیکن جہانگیر تک اس کی رسائی نہ ہوسکی، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دربار کا ملک الشعرا طالب آملی تھا، اور اس کے سامنے کلیم کا فروغ پانا ممکن نہ تھا، اسی سلسلہ میں یہ بات بھی کہنے کے قابل ہے کہ جس سال یعنی ۱۰۲۸ھ میں طالب آملی کو ملک الشعرائی کا خطاب ملا ہے، اسی سال کلیم ایران کو واپس گیا ہے، اس سے بدگمان طبیعتیں نتیجہ نکال سکتی ہیں کہ کلیم کو رشک نے ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا ہوگا،

کلیم کی ناکامیابی کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ نورجہان بیگم اس کی شاعری کی معتقد نہ تھی اور اکثر اس کے اشعار پر حرف گیری کیا کرتی تھی، ایک دفعہ کلیم نے ایک شعر کہا اور خوب دیکھ لیا کہ کہیں حرف رکھنے کی جگہ نہیں، شعر یہ تھا،

ز شرم آب شدم کاب را شکستی نیست ... بحیرتم کہ مرا روزگار چون بشکست

میں شرم سے پانی ہوگیا، حیرت ہے کہ زمانہ مجھ کو کیوں کر توڑ سکا، پانی تو ٹوٹنے کی چیز نہیں

کلیم نے یہ شعر نورجہان بیگم کے پاس بھیجا، نورجہان فوراً بول اٹھی کہ: یخ بست و پس شکست یعنی پانی کو پہلے یخ بنا دیا پھر توڑا،

معلوم ہوتا ہے کہ کلیم نے دربار میں پہنچنے سے پہلے جا بجا خاک چھانی، شاہجہان نامہ

---

۱ خزانہ عامرہ ۲ سرو آزاد تذکرۂ طالب آملی ۳ مراۃ الخیال، بعض تذکروں میں یہ واقعہ طالب آملی کی طرف منسوب ہے،

مین لکھا ہے کہ وہ دکن مین مارا مارا پھرا، اس کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ کلیم کا ایک
قصیدہ ابراہیم عادل شاہ کی مدح مین بھی ہے، ایک اور قصیدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیجاپور
کے ارادہ سے چلا تھا کہ راہ مین جاسوسی کے شبہہ مین پکڑا گیا اور قلعۂ شاہدرگ مین قید رکھا گیا،

چنانچہ کہتا ہے،

فلک قدرا نمے پرسی کہ گردون — چرا آزردہ مارا بے محابا
چرا آزردہ بیمار غمے را — کہ مے آمد بدرگاہِ مسیحا
بعزم سیر بیجاپور گشتم — رہے با اخترے چون دست (پیما)
بچنگ راہداران اوفتادیم — چہ گویم تا چہا کردند بر ما
ہمہ اندر تجسس موشگافان — ہمہ در گنج کاوے ذہن دانا
یکے گوید کہ دزد اند باشند — بزندان چند گہ زنجیر فرسا
دگر گوید کہ جاسوس فلانند — کہ از تفتیشِ ما گشتند بینا
یکے می گوید اینان را بکاوید — کہ شاید نامۂ گردد ہویدا
زبس تفتیش از ہم می کشودند — اگر در بار ما بودے معما (اسباب)
کنون در چنگِ ایشان مبتلایم — نمی دانیم چارہ جز مدارا
ز بہر پاس، ہندوہاے باتیغ (بپہرہ) — چو مو استادہ وایم بر سر ما
عجب دارم کہ با این منع جادہ — چسان بے خواست آمد تا بایں جا

یہ قصیدہ شاہ نواز خان کے نام لکھا ہے اور اخیر مین لکھا ہے،

اشارت کن کہ چون اقبال گردیم — بخاکِ آستانت جبہہ فرسا

بہرحال رفتہ رفتہ شاہجہان کے دربار مین رسائی ہوئی، اور ملک الشعرا کا خطاب ملا،

سنہ ۱۰۴۲ھ مین جب شاہجہان نے کرورہ روپیہ کی لاگت سو تخت طاؤسی تیار کرایا، اور آگرہ مین جشن نوروز کے دن اس پر جلوس کی رسم ادا کی، تو کلیم نے قصیدہ لکھا،

خجستہ مقدم نوروز و ہفتم شوال   فشاندہ اند چہ گلہاے عیش بر سر سال

شاہجہان نے اس کے صلے مین روپیہ کے برابر تلوایا، چنانچہ ۵۵۰۰ روپیہ وزن مین آئے اور اس کو عطا کئے،

کلیم شاہجہان کے ساتھ کشمیر گیا تو وہان کی رنگینی اور آب وہوا کی دلآویزی کا اس قدر شیفتہ ہوا کہ وہین کا ہو رہا، بادشاہ سے درخواست کی کہ مجھ کو یہین رہنے کی اجازت دیجائے مین یہان بیٹھ کر اطمینان سے فتوحات شاہی نظم کرون گا، یہ درخواست منظور ہوئی سنہ ۱۰۵۵ھ مین جب شاہجہان پھر کشمیر گیا تو کلیم نے قصیدۂ تہنیت لکھ کر پیش کیا، اور خلعت، اور دو سو اشرفیان انعام مین پائین، سنہ ۱۰۶۱ ہجری مین وفات پائی، غنی نے سالِ تاریخ لکھا ع

طور معنی بود روشن از کلیم

عام حالات | کلیم بخلاف اور شعرا کے نہایت صاف دل، سیر چشم، فیاض طبع تھا، معاصر اور حریف شعرا کی عزت کرتا تھا اور گرم جوشی سے ملتا تھا، میرزا صائب اور میر معصوم (ابن میر حیدر معمائی) سے خاص محبت تھی، چنانچہ میرزا صائب نے ایک غزل مین اس کا ذکر کیا ہے[1]،

بغیر صائب و معصوم نکتہ سنج کلیم   دگر کہ زاہلِ سخن مہربانِ یک دگر اند

جلال اسیر کا بہت معتقد تھا، چنانچہ کہتا ہے[2]،

میرزائی ما جلال الدین بس ست   از سخن سنجان طلب لگاہِ سخن

---

[1] سروآزاد وتذکرہ میر معصوم [2] ایضاً تذکرۂ جلال اسیر

راستی طبعش استاد من ست　　　کج نهم بر فرقِ دستار سخن

ملک قمی نے جب انتقال کیا تو کلیم نے قطعۂ تاریخ لکھا، جس کے چند شعر یہ ہین،

ملکِ آن بادشاہ ملکِ معنی　　　کہ نامش سکۂ نقدِ سخن بود

چنان آفاق گیر از ملک معنی　　　کہ حد ملکش از قم تا دکن بود

بجستم سالِ تاریخش ز ایام　　　بگفتا اوسر اہلِ سخن بود

اکثر شعراے ایران باوجود اس کے کہ ہندوستان مین آکر خاک سے آسمان پر پہنچے لیکن ہندوستان کو گالیان دیتے ہین، بخلاف ان کے کلیم ہندوستان کا مداح اور افسانہ خوان ہے، ایک قصیدہ کی پوری تمہید ہندوستان کی مدح ہے، اس کا ایک شعر یہ ہے،

توان بہشت دوم گفتنش بہ این معنی　　　کہ ہر کہ رفت ازین بوستان پشیمان شد

کلیم نہایت حاضر جواب اور مضمون یاب تھا، قیصرِ روم نے شاہجہان کو خط لکھا کہ آپ صرف ہندوستان کے بادشاہ ہین، شاہجہان کا لقب کیون اختیار کیا ہے؟ شاہجہان کو بھی خیال ہوا کہ یہ غلط بیانی نہے، یمین الدولہ سے کہا کہ کوئی اور خطاب اختیار کرنا چاہیے، کلیم کو خبر ہوئی، اسی وقت قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جس مین لقب کی یہ توجیہ کی،[1]

ہند و جہان ز روے عدد ہر دو چون یکی ست　　　شہ را خطاب شاہ جہانی مبرہن ست

یعنی ہند اور جہان دونون لفظ کے عدد ایک ہین، (۵۹) اس لئے شاہجہان اور شاہ ہند دونون کہہ سکتے ہین،

خان جہان لودی نے جس کا اصلی نام پیرا تھا، جب بغاوت کی اور شکست کھا کر

[1] کلمات الشعرائے اسرخوش، لیکن سرخوش نے دوسرا مصرع جس طرح نقل کیا ہے دیوان مین نہین، اس لئے مین نے دیوان کے مطابق نقل کیا ہے،

مقتول ہوا تو اس کا اور اس کے شریکِ بغاوت دریا خان کا سر ایک ساتھ دربار مین آیا کلیم نے
برجستہ رباعی کہی،

این مژدۂ فتح از پے ہم زیبا بود — این کیف دوبالا چہ نشاط افزا بود
از کشتنِ دریا سرِ پیرا ہم رفت — گویا سرِ او حباب این دریا بود

شاعری کلیم نے شاعری کی تمام صنفون کو لیا ہے. قصائد کثرت سے ہین، کئی مثنویان ہین
غزلون کا دیوان الگ ہے، مثنوی مدت سے اپنے پایہ سے گرچکی تھی، کلیم کی مثنویان بھی
کم رتبہ بلکہ عامیانہ ہین، اتنی بات ہے کہ وہ نہایت چھوٹی چھوٹی چیزون پر نظم لکھتا ہے،
(اکثر شعرا کے نزدیک یہ بھی ابتذال مین داخل ہے) مثلاً انگوٹھی، قلمدان، کشتی، بندوق،
وغیرہ وغیرہ، سب کی شان مین قطعات اور رباعیان لکھی ہین،

ایک دفعہ گرمی دانے نکلے، اس پر ایک بڑا قطعہ لکھا، تپ آگئی، اس پر بھی نظم لکھدی،
اسی جزئی واقعہ نگاری کا اثر ہے کہ اور ایرانیون کے برخلاف، ہندوستان کے بہت سے پیشون،
صنعتون، پھولون اور پھلون کے نام لکھدئے ہین جن کا نام بھی زبان قلم پر لانا اور شعرا گناہ
سمجھتے تھے، عرفی عمر بھر ہندوستان مین رہا، لیکن عمر بھر مین صرف ایک ہندی لفظ جھگڑ
زبان سے نکلا، وہ بھی اس طرح بدل کر کہ گویا فارسی ہے، طالب آملی نے رام رنگی ایک شعر
مین باندھ دیا، اس کو لوگون نے تعجب سے دیکھا، لیکن کلیم سیکڑون ہندی الفاظ بولتا چلا جاتا ہے مثلاً

مشو بوعدہ تنبولیان دل — کہ جز خون خوردن از وی نیست حاصل
ز حسنِ شستہ دھوبی چہ گویم — ازان بے پردہ محبوبی چہ گویم
ز نور حسن با جہل پٹھانی — چو گردد جمع نتوان زندگانی
بتانِ راجپوت و شیخ زادہ — شکیبِ عاشقان بر باد دادہ

چہ چینبہ شعلۂ شمعے ست بے دود	کہ آتش می زند در خرمنِ عود
زموزونان نظر در یوزہ دارم	کہ وصفِ مولسری را بنگارم
گل گڑھل نہ فہمید ست موسم	شگفتہ چون رخِ یارست دایم
نہال نیمش از بس خوش نسیم ست	دلِ طوبیٰ زرشکِ آن دونیم ست

جو قابل ذکر واقعات اس کے زمانے مین پیش آئے، سب پر اس نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے، عالمگیر شہزادگی کے زمانے مین جب اس کی عمر ۱۴ برس کی تھی، مست ہاتھی سے لڑا تھا، جس کی کیفیت ہے کہ شاہجہان ہاتھیون کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا، شہزادے بھی گھوڑون پر سوار تماشے مین مصروف تھے، عالمگیر قریب سے دیکھنے کے لئے جوشِ شجاعت مین گھوڑے کو آگے بڑھائے جاتا تھا، ایک ہاتھی حریف کو چھوڑ کر عالمگیر پر جھکا، عالمگیر نے پیشانی کو تاک کر برچھا مارا، ہاتھی نے غصہ مین آکر گھوڑے کو دانتون مین دبالیا، عالمگیر زمین پر آیا، لیکن جھٹ پٹ اٹھ کر ہاتھی پر حملہ آور ہوا، ادھر راجہ جے سنگھ نے بڑھ کر پے در پے برچھے کے وار کئے، ساتھ ہی مقابل کا ہاتھی آپہنچا، اور یہ ہاتھی بھاگ نکلا، شاہجہان نے عالمگیر کو گود مین لے کر پیار کیا اور اشرفیون مین تلوا کر اشرفیان خیرات کین[1]،

کلیم بھی اس واقعہ مین موجود تھا، چنانچہ ایک قطعہ اور ایک مثنوی مین اس واقعہ کی پوری کیفیت لکھی، مثنوی یہ ہے،

بہائی گوش اربابِ ہوش	یکے قصہ دارم بمن دار گوش
حدیثے سراسر بیانِ وقوع	بگویم بتو از زبانِ وقوع
زمردم من این نقل نشنیدہ ام	من از دل شنیدم دل از دیدہ ام

---

[1] شاہجہان نامہ، واقعات ۱۰۴۲ ہجری،

ابتدائی واقعات لکھ کر کہتا ہے،

دو دید از قضا آن دو فیلِ مہیب | یکے سوے شہزادہ اورنگ زیب
بمردی ز جا، یک سرِ مو نہ شد | ز راہ چنین سیل یک سو نہ شد
یکے نیزۂ برق سان تافتہ | نظر از رگِ غیرتش باختہ
ز قدرت چنان زد بہ پیشانیش | کہ جست از قفا برقِ رخشانیش
دران کوہ پیکر نہان شد سنان | دگر بار در رفت آہن بہ کان
ز خرطوم انداخت، پیچان کمند | فتاد اسپِ شہزادہ در پیل بند
گرفت اسپ شہزادہ رخے سوار | نہ بیم آب شد زہرۂ روزگار
چو در اسپ سامانِ جولان ندید | چو شہبازے از خانۂ زین پرید
ہمان دم کہ بر خاک پا را فشرد | روان دست جرأت بشمشیر برد
علم کردہ شمشیر بروے دوید | گزان سوے فیلِ غنیمش رسید
درین سن اگر بودے افراسیاب | ہمی گشت از دیدنِ فیل آب
در آغاز و انجام آن گیرودار | ہمی دید شاہنشہِ کامگار
ازان شیر دل چون بدید آن جگر | بفرقش بیفشاند گنج دگہر
نظر کردۂ شاہِ آفاق شد | بمردانگی در جہان طاق شد

قصائد | قصیدہ میں حاجی محمد جان قدسی کا انداز ہے، یعنی عرفی اور نظیری کی بیچیدادا اور مشکل بند شیں صاف کردیں اور مبالغہ اور حسن تعلیل کو وسعت دی، لیکن اس کے ساتھ قصیدہ کی متانت، زور، اور بلندی کم ہو گئی، اور غزلیت کا رنگ غالب آگیا،

جس چیز کو لوگ مضمون آفرینی کہتے ہیں، کلیم کے ہاں اس کی اس قدر بہتات ہے

کہ ہر قصیدہ گویا مضامین کا ایک انبار ہے۔ قصائد کی تمہید اکثر اصلی واقعات سے شروع کرتا ہے مثلاً موسم کی گرمی اور سردی یا سفر کی سختی، پہاڑون کی دشوارگذاری، لیکن خیالی مضمون آفرینیان کرکے ایک طلسم بنادیتا ہے، جسکو واقعیت سے کچھ علاقہ نہین ہوتا، تاہم جستہ جستہ ان ہی مین ایسے شعر بھی نکل آتے ہین، جو شاعری کی جان ہین، مثلاً ابر و بہار،

سحاب از تیر باران بہاری	بہ بستان جملہ گلہا را نشان کرد
بوئے آتش گل در گرفت است	کہ بلبل رفتہ در آب آشیان کرد
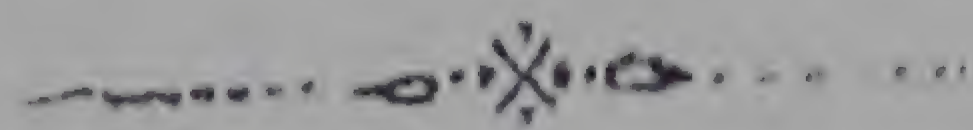
دگر بہار جہان راچنان گلستان کرد	کہ شوقِ سیرِ چمن، سرو را خرامان کرد
چو دام دار تہیدست از خجالت ابر	بزیر سبزہ، زمین روی خویش پنہان کرد
زنازکی نتوان غنچہ راز گلبن چید	گلِ حباب بیاروکسے بداماں گرد
نازکی کیوجہ سے کوئی شخص کلی کو توڑ نہین سکتا	جس طرح حباب کا پھول دامن مین نہین لیجا سکتا
چراغِ روز، نگوید فروغ می باشد	بہ بین کہ لالہ در دشت را فروزان کرد
یہ نہ کہو کہ دن کے چراغ مین، روشنی نہین ہوتی	دیکھو لالہ نے کس طرح صحرا کو روشن کردیا ہے

اگر ز عالم بالا نوید رحمت نیست	بخاک این ہمہ باران چہ می برد پیغام
سرود محفل ستان اگر دمے بشنود	نہادہ ابر بہر خانہ، سینہ برلب بام
شگوفہ پیرہن تر بشاخ اگرچہ فگند	ندید پرتو خورشید را درین ایام

سردی کی شدت،

خورشید دگر نقاب دار ست	منقل، معشوق در کنار ست

منقل = انگیٹھی

محرابِ جہانیان بخاری ست (آتشدان)   تسبیحِ خلائق از شرارست

چون آئینہ بستہ شد منفسہا   دل اندرم سپہرِ سنگ سارست

یخ بر سرکوچہ بستہ می آید   نہ راہ پیادہ نے سوارست

گوئی تو، کہ پنبہ اش زبرف است   پوشش برتن اگر ہزارست

مرغابی ہمچو نقش ابرے   برکاغذ یخ بہ یک قرارست

ماہی در یخ میان جدول   چون موج بہ تختۂ چنارست

اس زمانے مین قصائد کا کمال صرف مبالغہ، تشبیہ، حسنِ تعلیل، اور مغالطۂ شعری پر محدود تھا، اور اس مین شبہہ نہین کہ یہ اوصاف کلیم کے قصیدون مین نہایت افراط، اور نہایت وسعت کے ساتھ پائے جاتے ہین، اس کے یہان ترکیبون کا سلجھاؤ، روزمرہ کی صفائی محاورات کی برجستگی، شستگی اور روانی بھی اس حد تک ہے کہ اس کے ہمعصرون مین نہین ہے، طالب آملی سے وہ جدت، استعارات اور شوخی مین کم ہے، لیکن اور اوصاف مین اُس سے بہت آگے ہے، بعض بعض قصیدون کے مسلسل اشعار ہم اس موقع پر نقل کرتے ہین، جس سے اسکا اندازہ ہوگا،

در آستانِ جلالش عصاے دربان را   فلک ز سدرۂ رضوان ز شاخِ طوبیٰ داد

کفِ سخاش غلط بخش نیست ہمچو سحاب   سحاب ہرچہ بدریا فشاند بیجا داد

فراستش بخبر گیریِ ممالک رفت   چو بازگشت خبر ز آشیانِ عنقا داد

بہ تیرِ امرِ ش بحکمِ نفاذ داد آن کس   کہ دلبری بکمانِ ابروانِ رعنا داد

نمود خاکِ درش را کہ توتیا این ست   خدا نخست بہر کس کہ چشمِ بینا داد

چو خسروان کہ اسیرِ غنیم با ز دہند   کفِ عطاش گہر را دگر بدریا داد

یعنی جس طرح بادشاہ، دشمن کے قیدیون کو واپس کردیتے ہین، ممدوح نے موتی دریا کو واپس دیدیئے،
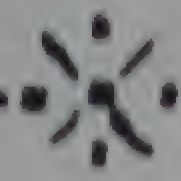
گردون نشاط کودکے، از سر چنان گرفت | کانگشترِ کواکبش، از سر توان گرفت

آسمان اس قدر طفلانہ خوشی مین مصروف ہے کہ چاہین تو اُسکے ہاتھ سے ستارون کے چھلّے اتارلین اور اسکو خبر نہو،

از شیشہ استفاضۂ انوار می کنند | عالم تمام مذہبِ اشراقیان گرفت

اکنون ہجومِ کام بود مانعِ وصال | گل پر شد آنچنان کہ در بوستان گرفت

اب مقصد کا ہجوم ہی وصال کا مانع ہے | پھول اس قدر پھٹ پڑے ہین کہ باغ کا دروازہ رک گیا

زین سان کہ روزگار جوانمرد خوش اداست | تا دامنِ عزرفتہ توان از جہان گرفت

این روئے تازہ کہ جہان را نمودرد | گوئی زگرد موکبِ شاہجہان گرفت

مدحیہ مضامین ہزارون دفعہ پامال ہوچکے ہین، اس لئے کسی شاعر کی زورِ طبع اور جدت آفرینی کا اندازہ کرنا ہو تو خاص ان موقعون کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے، کلیم اگرچہ مدح سے بچتا ہے یعنی طبیعت کا اصلی زور، بہار وغیرہ کی تمہید مین صرف کردیتا ہے تاہم اس کی جدت آفرینیان استعجاب کے قابل ہین،

بعہدش آنچنان در خواب امن ست | کہ باید پاسبانے پاسبان را

اس کے زمانہ مین لوگ اس قدر چین سے پڑے سوتے ہین کہ خود پاسبان کیلئے ایک پاسبان درکار ہے

بملکش راہزن مانند جادہ | بمنزل می رساند کاروان را

اس کی سلطنت مین خود راہزن، راستہ کی طرح قافلہ کو منزل تک پہونچا دیتا ہے،

بعہدِ عدلِ او دایس ستانند | چمن از خاک زرہائے خزان را

کفش پرداخت کانِ گوہرِ نزر | فلک برچید آخراین دکان را
درونِ شیشۂ افلاک بیند | بسانِ مے، فضاے آسماں را

زحرف رفعتِ شانش قلم بخود لرزد | بہ احتیاط، قدم می نہند در گفتار
دلش غبار خلائق نکردہ است قبول | نگیرد آئینۂ آفتاب را زنگار
سخن بگفتنِ اول بہ نزد فطرت اد | عجب مدار کہ معیوب گردد از تکرار
بروز گارش، ناراستی بر افتادہ است | بغیر سیل ینابی بہ دہر کج رفتار
گناہِ عالمیان گر ہمہ صدا گردد | زکوہ حلمش آواز نشنوی یکبار

غزل | کلیم کا اصلی کمال غزل گوئی ہے، غزل مین اس کے پیش رؤن نے خاص خاص باتین پیدا کی تھین، مثلاً عرفی نے فلسفہ، نظیری نے تغزل، طالب آملی نے شوخی استعارات، وحشی اور میلی نے معاملہ بندی، کلیم کے ہان گو تغزل کے سوا اور سب کچھ ہے لیکن اس کا خاص رنگ مضمون بندی اور خیال آفرینی ہے، مثالیہ جو صائب کا خاص انداز ہے، اس کی ابتدا بھی کلیم ہی نے کی، فلسفہ مین وہ بہت دقیق باتین پیدا نہین کرتا، لیکن اس عنوان پر اس نے جو کچھ لکھا ہے جمع کیا جائے تو اچھا خاصہ فلسفہ ہو جائیگا، غزل مین اس کے خصوصیات کو ہم الگ الگ عنوان کے ذیل مین لکھتے ہین،

مضمون آفرینی اور خیال بندی | جس چیز کو لوگ مضمون آفرینی کہتے ہین، اس کی تحلیل کی جائے تو وہ یا کوئی نیا استعارہ یا تشبیہ ہوتی ہے، یا کوئی انوکھا مبالغہ ہوتا ہے، یا کوئی شاعرانہ دعوی ہوتا ہے جو در اصل صحیح نہین ہوتا، لیکن شاعر اس کا مدعی ہوتا ہے اور شاعرانہ استدلال سے ثابت کرتا ہے اسی کو حسنِ تعلیل بھی کہتے ہین، یہ سب باتین کلیم کے ہاں نہایت اعلیٰ درجہ پر پائی جاتی ہین، مثلاً،

بسکہ ز دیدہ ریختم خون دل خراب را ۔ گریہ گرفت در حنا پنجۂ آفتاب را

مین نے اس قدر خون آنکھون سے بہایا کہ میرے انسوؤن نے آفتاب کے پنجہ مین مہندی لگادی،

می نہم در زیر پاے فکر کرسی از سپہر ۔ تا بکف می آورم یک معنی برجستہ را

فکر کے پاؤن کے نیچے آسمان کی کرسی رکھ لیتا ہون، تب ایک برجستہ مضمون ہاتھ مین آتا ہے

سپہر دون در فیض آنچنان بست بعالم ۔ کہ سیلاب بہاری، تر نمی سازد لب جو را

آسمان نے فیض کا دروازہ اس طرح بند کر لیا ہے کہ بہار کا سیلاب، نہر کے لب کو بھی تر نہین کر سکتا،

حدیث بحر فراموش شد کہ دور از تو ۔ ز بس گریستہ ام، آب برد دریا را

لوگ دریا کی کہانی بھول گئے، اس لئے کہ مین اس قدر رویا کہ دریا کو پانی بہالے گیا،

شعلہ بر می خاست از بیطاقتی دمی نشست ۔ من نہ جنبیدم ز جا تا جا بہ گلخن داشتم

شعلہ بے صبری کی وجہ سے اٹھ اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا، لیکن مین جب تک آگ مین رہا ذرا جنبش نہین کی

خون دل، روبہ کمی کرد ز سوز تپ ہجر ۔ آن قدر نیست کہ یک آبلہ را آب دہد

شراب کہنہ می نوشم بہ بزم او چو بنشینم ۔ بمن تا نوبت آید، دختر رز پیر می گردد

ز دان برق حسن کافت ہر گوشہ گیر شد ۔ آتش در آشیانہ عنقا گرفتہ است

یک رہبرم درین شب تاریک بر نخورد ۔ چون آفتاب دست بدیوار می کشم

اس شب تاریک مین مجکو کوئی رہنما نہین ملا، آفتاب کی طرح مین دیوار پکڑ کر چلتا ہون،

مثالیہ | مثالیہ مضامین پہلے بھی خال خال پائے جاتے تھے، امیر خسرو کا مشہور قصیدہ سرتاپا اسی صنعت مین ہے، لیکن کلیم، حزین، صائب اور غنی نے گویا اس کو ایک خاص فن بنادیا، چونکہ یہ تینون شاعر کشمیر مین مدت تک ساتھ ہمدم و ہم قلم رہے تھے، اور باہم مشاعرے رہتے تھے، اس لئے قیاس یہ ہے کہ ہم صحبتی کے اثر نے اس طرز کو مشترک جولانگاہ بنادیا، علی قلی سلیم بھی

شالیمین کمال رکھتا ہے اور اس کی بھی وجہ شاید یہی ہو کہ سلیم بھی یہین (کشمیر مین) مدفون ہی،
بہرحال کلیم نے اس صنف کو بہت ترقی دی، اس کے اکثر دعوے فی نفسہ صحیح ہوتے ہین
لیکن استدلال شاعرانہ ہوتا ہے، بعض جگہ دعوی اور دلیل دونون خیالی ہوتے ہین، اور وہان
شاعرانہ تخئیل زیادہ پائی جاتی ہے، مثلاً،

جز سوز عشق نیست سراسر بیان ما — چو شمع ایک سخن گذرد بر زبان ما

مرا مسوز کہ نازت ز کبریا افتد — چون خس تمام شود شعلہ ہم ز پا افتد

مجھکو نہ جلاؤ ورنہ تمھارا ناز بھی جاتا رہے گا، جب خس جل چکتا ہے تو شعلہ بھی بجھ جاتا ہے،

روشن دلان خوشامد شاہان نگفتہ اند — آئینہ عیب پوش سکندر نمی شود

مدعی گر طرف ما نشود، صرفہ اوست — دست آن بہ کہ بہ آئینہ برابر نشود

دشمن اگر ہمارا مقابلہ نہ کرے تو اس مین اسی کا فائدہ ہے، بدصورت کے حق مین یہی بہتر ہے کہ آئینہ
کے سامنے نہ لائے،

مقبول روزگار نگشتیم دانیم — مارا کہ برنداشتہ، چون بر زمین زند

در محفلے کہ تازہ در آئی گرفتہ[1] باش — اوّل بہ باغ، غنچہ گرہ بر جبین زند

در روزگار دیدم از راستی نشان نیست — صبحش گر صادق آمد، در شیر آب دارد

زمانہ مین سچائی کہین نہین پائی جاتی، صبح صادق کو، صادق کہتے ہین، لیکن وہ دودھ مین
پانی ملاتا ہے، صبح کی روشنی کو دودھ سے تشبیہ دی ہے،

قطع امید کردہ، نخواہد نعیم دہر — شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

روشن دلان، حباب صفت دیدہ بستہ اند — روزن چہ احتیاج، اگر خانہ تار نیست

[1] گرفتہ، یعنی اپنے آپ کو لئے ہوے، جس سے بظاہر رکھائی محسوس ہو،

روزگار اندر کمین بخت ماست | دزد دایم در پے خوابیدہ است

پامال حوادث، نتوانم کہ بناشم | چون نقش قدم، خانۂ من بر سرِ راہ است

داروا اگر صفاے دل از شراب دارد | روشن تر است شیشہ و قتیکہ آب دارد

دل میں صفائی آتی ہے تو شراب سے آتی ہے، شیشہ میں جب پانی ہوتا ہے تو زیادہ چمکتا ہے،

صبر گوارا کند ہر چہ ترا ناخوش است | ساعتے از کف بنہ، آبِ گل آلود را

ناگوار چیز بھی صبر کرنے سے گوارا ہو جاتی ہے، پانی گرد آلود ہو تو ذرا ٹھہر جاؤ گرد نیچے بیٹھ جائے گی،

کیسۂ پر وعدہاے بخت نتوان دوختن | خفتہ گر در خواب حرفی گفت از ان آگاہ نیست

دل گمان دارد کہ پوشیدہ است آز عشق را | شمع را فانوس پندارد کہ پنہان کردہ است

دلِ آگاہ مے باید و گرنہ | گدایک لحظہ بے نامِ خدا نیست

می بذیرند بدان را بطفیل نیکان | رشتہ را پس ندہد[۱] آن کہ گہر می گیرد

چون خس و خاشاک سیلاب ایمنم از گمرہی | پا بدوش راہبر، دایم بمنزل میروم

ہمکو سیلاب کے خس وخاشاک کی طرح گمرہی کا ڈر نہیں، اس لیے کہ ہم خود رہنما کے کندھوں پر سوار ہو کر سفر کرتے ہیں، یہ ظاہر ہے کہ خس وخاشاک کا رہنما سیلاب ہی ہے اور خس وخاشاک سیلاب ہی کے کاندھے پر سوار ہیں ۔

نام و نشان زعشق بغیر از ہوس نماند | از سیلِ رفتہ خار و خسے یادگار ماند

از خاک بر گرفتۂ[۲] دوران چونے سوار | دایم پیادہ رفت اگرچہ سوار شد

از ہنر، حالِ خرابم نشد اصلاح پذیر | ہمچو ویرانہ کہ از گنج خود آباد نہ شد

ہنر اور علم نے میری حالت کی اصلاح نہ کی، جس طرح ویرانہ کہ خزانے نے اس کو آباد نہ کیا،

---

[۱] پس دادن، واپس دینا، [۲] یعنی جس کو زمانہ نے بلند کیا ہو،

اقلیم بروز مسخر نمی شود
این فتح بے شکست میسر نمی شود

چرخ از بہر تو در کار بود حرصِ تو حیلیست
آسیا از پے رزق دگران بر گردد

سفلہ از قرب بزرگان نکند کسب شرف
رشتہ پر قیمت از آمیزشِ گوہر نشود

دستِ ہر کس را لبسان سبحہ بوسیدم چہ سود
ہیچ کس نکشود آخر عقدۂ کارِ مرا

با من آمیزش او الفتِ موج ست و کنار
دمبدم با من و پیوستہ گریزان از من

چہ ہست قدرت دستِ دلِ توانگر را نیست
صدف کشادہ کف است آن زمان کہ گوہر نیست

وضعِ زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست
رو پس نہ کرد ہر کہ ازین خاکدان گذشت
مڑ کر نہ دیکھا

بخضرم احتیاجے نیست گر این است گمراہی
کہ کوران را عصا ہم می تواند راہبر باشد

نہ ہر کہ صدر نشین شد عزیز شد کہ غبار
اگر بدیدہ رسد توتیا نخواہد شد

واصل[1] ز حرف چون و چرا بستہ است لب
چون رہ تمام گشت جرس بے زبان شود

شیطان چہ تمتع برد از اہل تجرد
رہزن چہ درین بادیہ از ریگِ روان یافت

تمام نسلِ بزرگان اگر نکو باشند
ز بحر زادہ تنگ ظرفی حباب چرا ست

گر بقسمت قانعی بیش و کم دنیا یکے است
تشنہ چون یک جرعہ خواہد کوزہ و دریا یکیست

پست فطرت، ہوسِ گوشۂ عزلت نکند
تا گرا بر سرہ نیست دلش خرم نیست

امروز چراغ اہل فقرم
چون فانوسم ز دو پیراہن نیست

خاکساران بیشتر از فیض قسمت می برند
کلبۂ دیوار کوتاہان پر از مہتاب بود

چشم از جہان بہ بستم نورِ دلم فزون شد
روشن شدہ است خانہ چو روزنش گرفتم[2]

قوت تخییل

اکثر لوگون کے نزدیک شاعری صرف قوت تخئیل کا نام ہے، اور اگر یہ صحیح ہے تو کلیم ہمہ تن

[1] یعنی جو شخص مدارج معرفت طے کر کے منزل تک پہنچ گیا ہے [2] یہان گرفتن کے معنی بند کرنے کے ہین،

شاعری ہے، اس کا ہر شعر قوت تخیل کا ایک منظر ہے، شاعر کو تمام عالم اور عالم کے تمام واقعات قوتِ تخیل کی وجہ سے ایک اور ہی صورت مین نظر آتے ہین، مثلاً ہوا کے زور سے پھول کا ایک پتہ ٹہنی سے ٹوٹ کر پانی مین گر پڑا، یہ ایک معمولی واقعہ ہے، لیکن شاعر کو قوت تخئیل سے نظر آتا ہے کہ یہ بہار کے حسن کا دفتر ہے، اور چونکہ معشوق کے حسن کے سامنے اس کی قدر نہین ہوسکتی اس لیے بہار نے اس دفتر کو پانی سے دھو ڈالنا چاہا ہے،

دفترِ حسنِ بہارست کہ در عہد تو شست　　　　برگِ گل نیست، کہ از بادہ در آب افتادہ است

کلیم کے کلام کو دیکھو تو صاف نظر آتا ہے کہ مناظر عالم کی ایک ایک چیز پر اس کی نظر پڑتی رہتی ہے اور قوتِ تخئیل سے یہ چیزین اس کے سامنے نئے نئے رنگ مین جلوہ گر ہوتی رہتی ہین،

وہ اندھیری راتون مین گھبراتا ہے اور اس کو نظر آتا ہے کہ ستارون کے چراغ مین روغن نہین رہا،

بعد ازین تاریکیِ شبہا نجو دخوش کن کلیم　　　　شکوہ کم کن، در چراغِ اختران روغن نماند

حکما کہتے ہین کہ عالم کا آغاز اور انجام معلوم نہین، کلیم کی نظر مین قوتِ تخئیل سے عالم ایک پرانی کتاب بن کر نظر آتا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے اوّل و آخر کے ورق گر گئے ہین،

ماز آغاز وز انجام جہان بیخبریم　　　　اوّل و آخر این کہنہ کتاب افتادہ است

محتسب کی دار و گیر نے میخانے برباد کر دیئے، لیکن کلیم یہ کہتا ہے کہ معشوق کی آنکھین میکدہ ہین اور اس کی مستی کے آگے شراب کی قدر نہین، اس لیے کوئی شخص میخانون کی طرف رخ نہین کرتا، اور وہان خاک اڑنے لگی، اس کے تو دید یہ محتسب کی کارگذاری نہین بلکہ محتسب معشوق کی آنکھ کا ممنون ہے،

شکر چشم تو کند، محتسب شہر کز و — ہر کجا میکدۂ ہست، خراب فتادہ است

بہار مین ہر شخص چاہتا ہے کہ سب سے پہلے پہونچ کر لبِ جو پر قبضہ کرکے، کلیم کی وسعت تخئیل دیکھو، وہ سبزہ سے بھی پہلے، لبِ جو پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

در بہاران جائی افتد بدستِ کس بباغ — پیشتر از سبزہ می باید کنارِ جو گرفت

بہار مین کسی کو جگہ باغ مین نہین ملتی، اس لئے سبزہ سے بھی پہلے چل کر لبِ جو پر قبضہ کر لینا چاہئے

صبح کے وقت کلیون کی شگفتگی، ہر شخص کو لطف دیتی ہے۔ لیکن دیکھو کلیم اس کو کس نظر سے دیکھتا ہے،

شیرینی تبسم ہر غنچہ را مپرس — در شیر صبح، خندۂ گل ہا شکر گداشت

کلیون کی شیرینی تبسم کا لطف نہ پوچھو، پھولون کی ہنسی نے صبح کے دودھ مین شکر گھول دی

سب لوگ کہتے آئے ہین کہ آسمان قابل آدمیون کا دشمن ہے۔ کلیم کو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ آسمان کو قابل اور نا قابل کی تو تمیز ہی نہین، قابل آدمیون کو پہچانتا کیونکر ہے کہ خاص انہی کو ستاتا ہے،

حیرتے دارم کہ گردون چو بدنایابان بدست — او کہ نتواند میانِ نیک و بد تمیز کرد

آگ کی لو اکثر اونچی ہو ہو کر کم ہو جاتی ہے۔ کلیم کو نظر آتا ہے کہ شعلہ مین ضبط کی طاقت نہین اس لئے بیقراری کی وجہ سے اٹھ اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ مین اپنے سکون اور استقلال پر فخر کرتا ہے،

شعلہ برمی خاست از بے طاقتی دمی نشست — من نہ جنبیدم ز جا تا جا بہ گلخن داشتم

مر کر کوئی زندہ نہین ہوتا۔ کلیم کو اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا ایسی چیز ہے کہ کوئی شخص دوبارہ اس کے دیکھنے کے لیئے رخ نہین کرتا۔

وضعِ زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست — رو پس نہ کرد، ہر کہ ازین خاکدان گذشت

رہ نوردی مین پاؤن مین چھالے پڑگئے ہین، انھی مین کانٹے بھی چبھتے جاتے ہین،
کلیم سمجھتا ہے کہ یہ انگلیاں ہین، اور راستہ ان انگلیون سے میرے چھالوں کا حساب رہا ہے،

دارم رہے بہ پیش کز انگشت خارہا — از من حسابِ آبلۂ پا گرفتہ است

کلیم ان مضامین سے جو مدتون سے جولانگاہ خیال ہین ایسے نکتے پیدا کرتا ہے، جنکی طرف
کسی کا خیال نہین گیا،

مثلاً یہ عام اعتقاد ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے تقدیر سے ہوتا ہے، کلیم کہتا ہے،

این قدر فرق میانِ خط یک کاتب چیست — سرنوشت ہمہ گر از قلمِ تقدیر ست

اگر سب کی سرنوشت تقدیر ہی نے لکھی ہے تو ایک کاتب کے خط مین اس قدر فرق
کیون ہے کہ ہر شخص کی تقدیر الگ الگ ہے،

جنون اور صحرا نوردی کا مضمون سب باندھتے آتے ہین، کلیم باوجود ادعاے جنون
کے صحرا نوردی اختیار نہین کرتا اور اس سے جنون کا زیادہ زور ثابت کرتا ہے،

اگر بہ بادیہ گردی نمی روم، چہ عجب — جنونِ من نہ شناسد ز شہر صحرا را
مین اگر صحرا مین نہین جاتا تو تعجب کیا ہے — میرا جنون شہر اور صحرا مین تمیز نہین کرسکتا

اس مین صحرا نوردون پہ چوٹ بھی ہے کہ پورا جنون ہوتا تو ان کو شہر اور صحرا کی تمیز کیونکر
ہوتی کہ جب بھاگتے تو صحرا ہی کی طرف بھاگتے،

عنقا کا تجرد اور ترکِ تعلقات، عام مضمون ہے، کلیم اس کے تجرد کو ناتمام سمجھتا ہے

در کیشِ ما تجردِ عنقا تمام نیست — در فکر نام ماند اگر از نشان گذشت

زمانہ کی انقلاب پسندی کے سب مدعی ہین کلیم کو اس پر تعجب ہے کہ پھر میری حالت

کیون نہین بدلتی،

ز انقلابِ سپہر دورو، عجب دارم		کہ بیقراری ما را بہ یک قرار گذشت

باغبان اور گلچین ہمیشہ پھول توڑتے ہین، کلیم کلیون کا توڑنا ثابت کرتا ہے،

اور اس کی کس قدر عمدہ توجیہ کرتا ہے،

در گلستان بہ یاد دہانِ تو غنچہ را		امسال باغبان ہمہ نشگفتہ چیدہ بود

باغبان کو تیرا دہن یاد آیا، تو اس نے		اب کی سال تمام پھول بن کھلے توڑ لیے

حسنِ اخلاق کی بڑی دلیل، لوگون کے نزدیک قبولِ عام ہے، یعنی جب آدمی کے اخلاق عمدہ ہوتے ہین، جب ہی مقبولِ عام ہوتا ہے، کلیم کہتا ہے، نہین، بلکہ نفاق سے یہ درجہ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ ظاہر داری کے بغیر حسنِ قبول نہین حاصل ہو سکتا اور ظاہر داری درحقیقت نفاق ہے،

پسند خاطرِ یک تن نیم چہ چارہ کنم		کہ بے نفاق بہ یک دل نمی توان جا کرد

جو لوگ بیقاعدہ کام کرتے ہین ان کی بے قاعدگی اس قدر پختہ ہوتی ہے کہ کبھی بھول کر بھی کوئی کام باقاعدہ نہین کرتے، کلیم اس سے یہ نتیجہ پیدا کرتا ہے کہ وہ بے قاعدہ نہین کیونکہ ان کی بے قاعدگی باقاعدہ ہے، اس خیال کو ایک شاعرانہ پیرایہ مین ادا کرتا ہے،

گاہے، بہ غلط ہم سوے مقصود نہ رفتیم		گویا رہِ آوارگیم، راہبرے داشت

ہم بھول کر بھی کبھی مقصد کی طرف ایک قدم نہین گئے، معلوم ہوتا ہے کہ آوارگی کے راستہ مین ہمارا کوئی رہبر نہین،

زاہد کی صدانہ تسبیح پر شعرا اعتراض کیا کرتے ہین، لیکن کلیم اس کی ضرورت ثابت کرتا ہے،

دانہ بسیار در کار ست، بہرِ صیدِ خلق		حق بدستِ زاہد ست ار سبحہ را صدانہ ساخت

راہِ طلب میں منزلِ مقصود کے رخ پر چلا جانا اور ادھر ادھر مڑکر نہ دیکھنا مستحسن خیال کیا جاتا ہے، لیکن کلیم کہتا ہے،

طلبِ شاہد مقصود ز ہر سو شرط است ہر قدم در رہ او رو بقفا باید کرد

شاہد مقصود کو ہر رخ سے ڈھونڈھنا ضروری ہو، اس لئے اس راہ میں ہر قدم پر مڑکر بھی دیکھنا چاہئے،

روزمرہ اور محاورہ

اس زمانہ میں اگرچہ مضمون آفرینی اور خیال بندی کے استیلا رنے زبان اور محاورہ بندی کی طرف سے شعرا کو غافل کر دیا تھا، چنانچہ ناصر علی، غنی، بیدل، اسی چکر میں پڑکر لطفِ زباں سے بیگانہ ہو گئے۔ لیکن کلیم باوجود انتہا درجہ کی نازک خیالی کے یہ سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا، وہ ہمیشہ نئے مضامین پیدا کرنے کی فکر میں مصروف رہتا ہے، لیکن یہ نہیں بھولتا کہ وہ ایرانی ہے، ہندی نہیں، اس لئے روزمرہ کے علاوہ، اکثر ٹھیٹ محاورے برتتا ہے۔ جن کو عام آدمی فرہنگ کے بغیر سمجھ بھی نہیں سکتے، مثلاً،

با عارض تو چہرہ شدن حد شمع نیست	چہرہ شدن مقابل ہونا، حد نیست، یعنی مجال نہیں
گریان ز بزم رفت و سر خویشتن گرفت	سر خویشتن گرفت، اپنی راہ لی
از دبستان برود ہر کہ سبق روشن کرد	سبق روشن کرد، سبق یاد کرلیا،
ع، دشمن خود را چرا کس این قدر پہلو دہد	پہلو دادن، پہلو بچانا
رو نخواہم ساخت ہر صورت کہ خواہد رو دہد	رو ساختن، منھ بگاڑنا، رو دہد، پیش آئے،
امید بوسہ ات چہ نمک داشت اے کلیم	چہ نمک داشت یعنی اس میں کیا لطف تھا،
این شربت کم بہر دو بیمار نباشد	بہر حصہ، یعنی ایسا نہ ہو کہ یہ تھوڑا سا شربت دو بیماروں کے لئے کافی نہ ہو،
گہ گاہ ہم طرف کہربا نمی گیرد	طرف کسے گرفتن، اس کی جانب داری کرنا،

ع، بچشم روشنی دماغہاے کہنہ روم	چشم روشنی، مبارک باد
ع شام، خود شد روزہ امید روامی کنم	روزہ واکردن، روزہ کھولنا.
چون حباب ادام ہستی پس دہم خندان شوم	دام واپس دادن. قرضہ ادا کرنا،
عجب پیرے کہ می مالد جوان را	مالیدن پچھاڑنا
یک زبانم من دمی گویم	
سخنے را کہ پشت در دو دارد	پشت در دو داشتن سخن، یعنی دورخی بات
پیالہ چشم تو روشن کہ بادہ پیدا شد	چشم تو روشن، دعا کے موقع پر استعمال کرتے ہین،

اب ہم کلیمؔ کی دو تین غزلین پوری پوری اس موقع پر درج کرتے ہین جس سے اندازہ ہوگا کہ اسکا اکثر کلام یک دست اور ہموار ہوتا ہے، اس کے ساتھ اس کے عام لطف بندش، جدت ادا اور خوبیِ زبان کا اندازہ ہوگا،

پیری رسید و مستیِ طبعِ جوان گذشت — ضعفِ تن از تحملِ رطل گران گذشت

وضعِ زمانہ، قابلِ دیدن دوبارہ نیست — رو پس نہ کرد، ہر کہ ازین خاکدان گذشت

از دست بُردِ حسنِ تو بر لشکرِ بہار — یک نیزہ خون گل ز سرِ ارغوان گذشت

طبعے بہم رسان کہ بسازی بعالمے — یا ہمتے کہ از سرِ عالم، توان گذشت

در کیشِ ما تجرد عنقا تمام نیست — در فکر نام ماند اگر از نشان گذشت

بے دیدہ راہ گر نتوان رفت، پس چرا — چشم از جہان چو بستی ازو می توان گذشت

بدنامیِ حیات، دو روزی نبود بیش — آن ہم کلیمؔ با تو بگویم، چسان گذشت

یک روز صرفِ بستنِ دل شد بہ این و آن — روزے دگر، بہ کندنِ دل زین و آن گذشت

نه همی می رمد، آن نوگلِ خندان از من — می کشد خار درین بادیه دامان از من

با من آویزشِ او، الفتِ موجست و کنار — دمبدم با من و هر لحظه گریزان از من

گرچه مورم، ولے آن حوصله با خود دارم — که به بخشم، بود ار ملکِ سلیمان از من

به تکلم، بخموشی، به اشارت، به نگاه — می توان برد بهر شیوه دل آسان از من

قمری، ریخته بالم، به پناهِ که روم؟ — تا به کے سرکشی، اے سروِ خرامان از من

نیست پرهیزِ من از زهد که حاکم رهبر — ترسم آلوده شود، دامنِ عصیان از من

اشکِ بیهوده مریز این همه از دیده کلیم — گردِ غم را نتوان شست بطوفان از من

....

از ثباتِ عشق، دایم پا بدامن داشتم — همچو داغِ لاله، در آتش نشیمن داشتم

شعله بر می خاست از بے طاقتی نه می نشست — من نه جنبیدم ز جا تا جا بگلخن داشتم

کے بهر نامحرمے، چاکِ جگر خواهم نمود — من که زخمش را نهان از زخمِ سوزن داشتم

هیچ گه، ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت — دانه می چیدم من آن روزے که خرمن داشتم

روشنی از بزمِ من، دریوزه می کرد آفتاب — در چراغِ عیش تا از باده روغن داشتم

همچو ماهی غیرِ داغم، پوششِ دیگر نبود — تا کفن آمد، همین یک جامه بر تن داشتم

داغ را جز بر کنارِ زخم ننهادم کلیم

دیده را بر رخنهٔ دیوارِ گلشن داشتم

دار المصنفین کی ادبی کتابین

شعر العجم

حصۂ اوّل فارسی شاعری کی تاریخ اس عہد بعہد کی ترقیون اور ان کے خصوصیات کی تفصیل، مشہور شعرا کا تذکرہ، اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ قیمت: عام

حصۂ دوم شعرائے متوسطین خواجہ فریدالدین عطار سے حافظ اور ابن یمین تک کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تنقید، قیمت: عام

حصۂ چہارم ایران کی آب وہوا، تمدن اور دیگر اسباب کا فارسی شاعری پر کیا اثر پڑا، اس کی تفصیل، اور شاعری کے تمام انواع و اقسام مین سے مثنوی پر مبسوط تبصرہ قیمت: عام

حصۂ پنجم قصیدہ، غزل، اور فارسی زبان کی عشقیہ صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید، قیمت: عام

قیمت: عام

مولفہ مولینا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

نئی کتابین

بزم صوفیہ عہد تیموریہ کے پہلے کے صوفیہ کرام مثلاً شیخ علی ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ نظام الدین اولیا، وغیرہ کے مستند حالات و تعلیمات و ملفوظات، قیمت: عہ

بزم تیموریہ تیموری بادشاہون، شاہزادون، اور شاہزادیون کے علمی ذوق، اور ان کے دربار کے امرا اور فضلا کے مختصر تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل، قیمت: عہ

بزم مملوکیہ غلام سلاطین اور اُن کے امرا اور شہزادون کی علم نوازی کی تفصیل اس عہد کے علما و فضلا کے علمی و ادبی کارنامون پر تبصرہ اور ممتاز شعرا ریزہ، شہاب و عمید کا تذکرہ، اور اُن کے کلام پر تنقید، قیمت: عہ

قیمت: عہ

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے

(طابع و ناشر صدیق احمد)

........❀........